ہندوستان میں آج کل جو مسائل زیادہ اُلجھے ہوئے ہیں اور جو حل طلب ہیں اُن میں قومی زبان کا مسئلہ بھی ہے۔ ہندوستان کی قومی زبان کا مسئلہ کوئی نیا مسئلہ نہیں بلکہ کافی عرصہ سے زیر بحث ہے۔ گاندھی جی اور بعض دوسرے، ملک کے خیرخواہوں نے اُردو اور ہندی کے روزافزوں تنازع کو ختم کرنے کے لئے یہ صورت نکالی کہ عربی فارسی کے ثقیل اور سنسکرت کے بھاری بھرکم الفاظ کو نکال کر ایک ملی جلی زبان تیار کی جائے جو صاف اور آسان ہو اور صحیح معنوں میں ہندوستان کی زبان ہو۔ اس زبان کا نام انھوں نے ہندوستانی رکھا۔ کانگریس پہلے ہی ۱۹۲۵ء میں کہہ چکی تھی کہ کانگریس کی سرکاری زبان ہندوستانی ہی ہوگی جو دیوناگری اور اُردو دونوں رسم الخط میں لکھی جائیگی۔ بعد میں اسکی پھر توثیق کیگئی کہ شمالی ہند کے عام باشندوں کی زبان جو دونوں رسم الخط میں لکھی جاتی ہے ہندوستانی اسی کا نام ہے اور یہی زبان قومی زبان ہوگی۔ اُردو کے بعض زعما نے بھی جو صرف اُردو زبان ہی کے حق میں تھے مصالحت کا ہاتھ بڑھایا اور ڈاکٹر عبدالحق مولنا سید سلیمان ندوی اور دوسرے لوگ بھی اسی موعود زبان ہندوستانی کو اُردو کی جگہ دینے کے لئے تیار ہو گئے۔ خیال تھا کہ حکومت ملتے ہی زبان کا مسئلہ اسی طرح طے ہوگا جس طرح وعدہ کیا گیا تھا اور جس طرح کانگریس کمیٹی نے منظور کیا تھا۔ لیکن ابھی ہمارے ورراء زمام حکومت سنبھالنے بھی نہ پائے تھے کہ اُردو کی بیخ کنی شروع ہوگئی عام تقریروں میں ایک مصنوعی اور غیر فطری زبان استعمال کی جانے لگی، ہندی کی حمایت میں پروپیگنڈا ہونے لگا اور آل انڈیا ریڈیو نے ہندی نوازی بلکہ سنسکرت نوازی شروع کردی۔ تقسیم ہند کے بعد تو یہ پالیسی اور واضح ہوگئی اور اب تو صوبوں کی حکومتوں نے بھی کھلم کھلا ہندی نوازی شروع کردی ہے اور اسکولوں کی نیچی جماعتوں میں ہندی لازمی قرار دیدی گئی ہے۔

قومی زبان اصل میں وہی زبان بن سکتی ہے جو آسان ہو، عام فہم ہو، اور جو عوام کی زبان ہو۔ عوام پر نہ تو بوجھل سنسکرت لادی جا سکتی ہے اور نہ ثقیل فارسی عربی۔ جو قومی زبان ہوگی وہی حکومت کی زبان ہونی چاہیئے آج جو حکومت کی زبان ہے اور جسمیں اسکے کمیونکے وغیرہ شائع ہوتے ہیں انہیں اکثر عوام نہیں سمجھتے۔ قومی زبان اس طرح نہیں بنتی ہے جس طرح حکومت یو پی کے کارخانہ میں زبان ڈھالی جا رہی ہے۔ اُس میں آورد ہے اور تکلف ہے، تصنع ہے اس میں کوشش کو دخل ہے۔ زبان تو خود بخود بنتی ہے اور جسے عوام عام طور پر استعمال کریں وہی قومی زبان ہونی چاہیئے! اس میں اس کے مستند الفاظ کو عام ازیں کہ کسی بھی زبان سے کیوں نہ آئیں جوں کا توں رہنے دیا جاتا ہے آج تو تعصب برتا جا رہا ہے۔ عربی و فارسی کے رسیلے اور سبک الفاظ نکال کر پھینکے جا رہے ہیں انگریزی کے وہ الفاظ جو بہت نرم اور دلکش ہیں انھیں کھسوٹا جا رہا ہے اور اُن کی جگہ اس زمین میں سنسکرت کے غیر مانوس بوئے جا رہے ہیں۔ یہ کانگریس کے اعلان کردہ اور مسلمہ نصب العین سے فرار، اور اسکی طے شدہ لسانی پالیسی سے غداری کے مرادف ہے، بہتر ہے اور ہمیں یقین ہے کہ جو لوگ یہ حرکتیں کر رہے ہیں وہ آج نہیں تو کل ضرور پچھتائیں گے اور پھر انھیں اس منزل پر لوٹنا پڑیگا جہاں وہ بھی پہلے

اُردو اور قانون ساز اسمبلی:۔

گاندھی جی کے دشمن وہی نہیں ہیں جنھوں نے انھیں قتل کیا ہے اُن کے دشمن وہ بھی ہیں جو اُنکی رائے اور منشا اور اُن کے اصول کے خلاف رہے ہیں۔ گاندھی جی کا جسم فانی تھا اور اُسے کبھی نہ کبھی فنا ہونا ہی تھا لیکن اُن کے اصول امر ہیں۔ اور اُن کے آدرش ابدی۔ گاندھی جی خود کہا کرتے جسم مرتا ہے لیکن اصول نہیں مرتا۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کچھ لوگ اُن کے اصولوں کو بھی موت کی نیند سُلا دینا چاہتے ہیں [illegible]

بھی نشانہ کا مقام ہلا دینا چاہتے ہیں۔

پنڈت نہرو نے متعدد تقریروں میں اس بات پر زور دیا ہے کہ مورتیں بنانے سے اور مجسمے نصب کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ گاندھی جی کو زندہ رکھنا چاہتے ہو تو ان کے اصول اور تعلیمات کو زندہ رکھو۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ اُن کے اصولوں کے خلاف عمل درآمد ہو رہا ہے۔ انھوں نے ہمیشہ چاہا کہ ناگری اور اُردو دونوں رسم الخط باقی رکھے جائیں اور تمام دفتروں کی کارروائی میں دونوں زبانیں استعمال ہوں لیکن اس کے خلاف حکومت یُوپی نے یہ فیصلہ کر دیا کہ وہاں کی سرکاری زبان ہندی اور رسم الخط دیوناگری ہوگی۔ یہ فیصلہ یُوپی میں ہوا ہے۔ جہاں کے رہنے والوں کی چاہے وہ کسی فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں اصلی زبان اُردو ہی ہے جہاں اُردو پروان چڑھی۔ بہار اسمبلی نے بھی ہندی حکومت کی زبان قرار دی ہے پنجاب میں بھی یہی حکم نافذ کر دیا گیا ہے جہاں کی اکثر و بیشتر آبادی ہندی زبان اور ناگری رسم الخط سے ناواقف ہے اور جہاں زیادہ تر اُردو بولی اور سمجھی جاتی ہے جب ان صوبوں میں یہ حال ہے تو پھر دوسرے صوبوں میں کیا کچھ نہ ہوگا۔

ہند کی قانون ساز اسمبلی میں اس ماں کا مسئلہ پیش ہونے والا ہے۔ پنڈت نہرو نے ہمیں کئی بار یقین دلایا ہے کہ وہ اُردو زبان اور رسم الخط مٹانے کی تحریک کی پُرزور مخالفت کریں گے ہم چاہتے ہیں کہ سارے آزاد خیال لوگ جو نہرو حکومت کے ساتھ ہیں اور گاندھی جی کی تعلیمات کو عام رکھنا چاہتے ہیں اس موقع پر اُردو زبان اور رسم الخط کی تائید کریں گے ڈاکٹر راجندر پرشاد نے ہندی اُردو تنازع کا ذکر کرتے ہوئے کہا "ہندی اُردو سے خائف نہ ہونا چاہیئے درحقیقت اُردو کے اسالیب کو جذب کر کے ہندی مالا مال ہو جائے گی۔ [illegible] ہیں جو اُردو کے ہیں اس لیے یہ تنازع مجھے غیر حقیقی معلوم ہوتا ہے" میں ڈاکٹر صاحب سے کہوں گا کہ [illegible] ہمیں حکومت [illegible] ایوانوں کے اندر بھی گونجنی چاہیئے۔

مشرقی زبانوں کی اہمیت :-

مشرقی زبانوں میں فارسی اور عربی کی حیثیت ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں قدیم زبانوں کی حیثیت ہے اور ان کا مطالعہ ہوتا ہے جس طرح یورپ میں یونانی اور لاطینی زبانوں کا۔ دونوں میں ممکن ہے ایک گونہ مشابہت ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ یورپ کی قدیم زبانوں اور عربی و فارسی میں بڑا اہم فرق ہے۔ یونانی اور لاطینی مردہ زبانیں ہیں لیکن اس کے برخلاف عربی و فارسی زندہ اور طاقتور زبانیں ہیں۔ ان زبانوں کا مطالعہ ہمیں مردہ زبانوں کی طرح نہیں کرنا چاہیئے۔ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم میں عام طور پر قدیم درسی کتابیں رکھی جاتی ہیں جدید عربی پر بہت کم زور دیا جاتا ہے۔ اس زبان کے موجودہ تلفظ کی طرف بھی توجہ نہیں کی جاتی۔ اور نئے رسالوں اور [illegible] کی طرف سے تو بے حد بے توجہی برتی جاتی ہے۔ جب عربی و فارسی زندہ اور ترقی پسند زبانیں ہیں تو ہمیں انکی ترقیوں کا ساتھ دینا چاہیئے انکے نئے بہاؤ اور دھاروں کو جاننا اور پرکھنا چاہیئے۔ اور ان اسباب سے واقفیت حاصل کرنی چاہیئے جنکی بنا پر ہماری زبانیں نئے قالب اختیار کر رہی [illegible]

عربی و فارسی زبانوں کی اہمیت ہندوستان کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے مشکل یہ ہے کہ ہم عربی کو ایک مذہب کی زبان اور فارسی اور شاعری کی زبان سمجھنے لگے ہیں حالاں کہ انکی اہمیت اور فوائد بے انتہا ہیں۔ یہ زبانیں مسلمانانِ ہند اور مسلمانانِ عالم کے درمیان ثقافتی ہم آہنگی، یہ زبانیں مسلمانانِ عالم میں اتحاد اور یک جہتی کا بہت بڑا سبب اور ذریعہ بن سکتی ہیں مستقبل قریب میں جبکہ ایشیائی قومیں ایک دوسرے سے نزدیک تر ہو جائینگی تجارتی رشتے ہندوستان اور مشرق قریب کے درمیان ازسرِنو تازہ ہوں گے۔ عربی و فارسی زبانیں آپس کے رابطہ و تعلق کا واسطہ بنیں گی۔ ہمیں یقین ہے کہ مستقبل میں ان زبانوں کی اہمیت میں گوناگوں اضافہ ہوگا اور ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں

اسی طرح سکھائی جائینگی جس طرح یورپ میں فرانسیسی اور المانوی زبانیں سکھائی جاتی ہیں۔ اور اگر عربی
مضبوط و استوار ہوگئیں تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عربی سارے مسلمانانِ عالم کی مشترکہ زبان ثابت ہوگی۔
ہم اپنے لائق وائس چانسلر صاحب سے عرض کرینگے کہ عربی و فارسی کے شعبوں کی طرف خاص توجہ فرمائیں۔ ہمارے
اور لکھنے کی طرف متوجہ کیا جائے۔ ایرانی اور عرب اساتذہ کا یہاں تقرر ہونا چاہیئے۔ پنجاب یونیورسٹی کی مثال ہمارے سامنے
کالج میں ایک عرب موجود ہیں، خود علی گڑھ میں شیخ عبدالحق موجود تھے، شعبۂ فارسی میں بھی ایک ایرانی استاد کا تقرر کیا جائے۔
کہ اپنے طلبا کو مصر اور ایران جانے کے لئے کم از کم ایک وظیفہ ہر سال دے تاکہ وہ اعلٰی تعلیم حاصل کر سکیں اور وہاں زبان اور موجودہ ادبی سیاسی

عربی و فارسی نصاب تعلیم:-

صوبہ متحدہ میں عرصہ ہوا ایک کمیٹی اس غرض سے بنائی گئی تھی کہ صوبے میں عربی و فارسی مدارس جنھیں حکومت امداد دے رہی ہے
تعلیم پر غور کیا جائے، مولانا آزاد اس کمیٹی کے صدر تھے اس کے جلسے بھی ہوئے اور سب کمیٹیاں بھی بنا دی گئیں، علی گڑھ کے بھی دو
عبدالعزیز میمن اور مولانا ضیا احمد بدایونی علی الترتیب عربی و فارسی کمیٹیوں کے رکن تھے۔ مشاہیر اساتذہ نے مل کر بڑی محنت سے نصاب
اور بعض اصلاحات کی سفارش بھی کی۔ ہمیں جان کر افسوس ہوا کہ کام کی رفتار یک گونہ سست پڑگئی ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت
سلسلے میں مالی امداد دے اور اعانت کا ہاتھ بڑھائے تاکہ نہایت خوش اسلوبی سے کمیٹی کے سفارشات پر عمل درآمد کیا جا سکے۔

ہندوستانی اکیڈمی:-

ہمیں یہ جان کر افسوس ہوا کہ اواخر اگست ۱۹۴۸ء میں لکھنؤ میں ہندوستانی اکیڈمی کا جلسہ ہو جس میں یہ تجویز منظور کی گئی کہ ہند
اکیڈمی کا نام اب ہندی اکیڈمی کر دیا جائے گا اور اس کا مقصد اب صرف ہندی کی ترویج و ترقی ہی ہوگا۔ ہندوستانی اکیڈمی بلا شبہ
ہے اس کے ارکین بھی حکومت ہی مقرر کرتی ہے اس کا مقصد ابتک یہی تھا کہ ہندی اور اردو دونوں زبانوں کو ترقی دیکر ایک
بنایا جائے۔ ابھی حال میں جو اردو کو نکال کر صرف ہندی کی ترویج اس کا مقصد قرار دیا گیا ہو وہ کسی طرح مستحسن نہیں۔ یو پی
وفد سے جو آل احمد سرور صاحب کی سرکردگی میں اُن سے ملا تھا بہت ہی اُمید افزا باتیں کی ہیں اور یقین دلایا ہو کہ اردو کے
کریں گے۔ ہمیں امید ہو کہ وزیر موصوف اپنے وعدے کو بھولے نہ ہوں گے اور جلد ہی کوئی ایسا عملی اقدام کریں گے، اردو کو
حق دلا دے۔

نئے ستارے:-

آزادی کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں کچھ نئے رسالے شائع ہونے شروع ہیں ان میں "سویرا"
ذہن میں آتا ہے جو اپنے ترتیب مضامین، تنوع اور ظاہری تزئین و آرائش کے لحاظ سے اردو زبان کا سب سے بہتر رسالہ
میں بھی فخر کے ساتھ اردو زبان کا رسالہ کہہ کر پیش کر سکتے ہیں۔ یہ رسالہ اگرچہ پاکستان سے شائع ہوتا ہے لیکن
اور ہندوستان کی کوئی تخصیص نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ ادب کو خانوں میں بانٹ کر رکھا بھی نہیں جا سکتا۔
شامل ہیں، ابتک اس کے چار نمبر شائع ہو چکے ہیں، ہم اس کے لئے ساحر لدھیانوی صاحب کو جس قدر بھی مبارکباد دیں کم
• نقوش "زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب" کا ترجمان ہے۔ جسے ہاجرہ مسرور

نیا کے طالب علموں کی امیدوں کے مرجع ہیں عربی زبان وادب پر حیرت انگیز قدرت حاصل ہے اور بلے پناہ حافظہ
لک ہیں، ازمنۂ وسطیٰ کے عربی شعراء کے کئی لاکھ اشعار زبان پر ہیں۔ الزہراء (مصر) اور مجلہ المجمع العلمی
ں) کثرت سے مضامین لکھے، اب تک مندرجہ ذیل تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔

اقلید الخزانة (پنجاب یونیورسٹی) خلاصة السیر للمحب الطبری (دہلی) حیات ابن الرشیق
النطف من شعری ابن رشیق وابن شرف (مصر) ما اتفق لفظہ واختلف معناہ
قرآن للمبرد (مصر) ابواب مختارہ (مصر) ما تلحن فیہ العوام للکسائی (مصر) مقالۃ
ابن فارس (مصر) حواشی خزانة الادب ۴ جلد (مصر) (۶ جلدیں غیر مطبوعہ) حواشی لسان العرب
ابو العلاء وما الیہ (مصر) فائتۃ شعر ابی العلاء (مصر) رسالۃ الملائکہ (مصر) زیادات
ن المتنبی (مصر) سمط اللآلی ۳ جلد (مصر) نسب عدنان وقحطان للمبرد (مصر)
ن الافوہ الاودی (مصر) دیوان الشنفری الازدی (مصر) دیوان ابراهیم بن العباس
لی (مصر) الاختیار من دواوین المتنبی والبحتری وابی تمام (مصر) تسع قصائد نادرۃ

کتاب التنبیهات علی اغالیط الرواة لعلی بن حمزة البصری - بالکل مرتب ہے اور جلد
شائع ہونے والی ہے

و کتابیں زیر ترتیب ہیں ان میں دو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔
من نسب الی امہ من الشعراء   النکت علی طبعة مرجلیوث من معجم الادباء۔

ربی دنیا نے قدر افزائی میں کسی طرح کی کمی نہیں کی۔
کومت دمشق نے دنیا میں عربی زبان کی سب سے زیادہ مستند اور بڑی جماعت مجمع العلمی کا ممبر کن بنایا
ومت شام نے ابو العلاء المعری کی ہزار سالہ جوبلی کے موقع پر شام آکر ایک جلسے کی صدارت کی دعوت
انھیں لانے کے لئے اپنے ہوائی جہاز بھیجنے کا انتظام کیا۔
ومت مصر نے ذیل کی کتابیں مرتب کرنے کی استدعا کی اور اب انھیں حکومت مصر اپنے خرچ سے شائع کر رہی ہے
حشیات، وھی الحماسة الصغری لابی تمام، الفاضل للمبرد، دیوان کعب ابن
یل، دیوان سھیم ابن العید، دیوان حمید بن ثور۔
ومت ھند پر "چراغ کے نیچے اندھیرا" کی مثل صادق رہی۔ اسے اپنے جواہر ریزوں کی خبر نہیں۔ اب جبکہ
ن پر سے استعماری طاقتیں اپنا سایہ اٹھا چکی ہیں اور ملک آزاد ہو گیا ہے، ہمیں توقع ہے کہ حکومت ہند ان کی
نے میں دیر نہ کرے گی۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ مرکزی حکومت کے علوم و معارف کا قلمدان ایک ایسی گراں مایہ
کے ہاتھ میں ہے جو خود عربی اور اسلامیات میں بین القومی حیثیت و اہمیت رکھتی ہے اور جس پر علامہ موصوف کے
ہوئے نہیں ہیں۔

ڈاکٹر عابد احمد علی ام۔اے (علیگ) ڈی فل (آکسفورڈ) ابن السکیت کی اصلاح المنطق مرتب
ہیں۔ یوروپ سے انھوں نے روٹو گراف (عکسی نقلیں) حاصل کرلی ہیں، وہ اسے جلد ہی شائع کرنے والے ہیں۔

مولانا بدر الدین علوی، ۱۹۲۷ء میں شرح المختار من شعر بشار، اور ۱۹۲۸ء میں دیوان شعر الامام ابی بکر بن درید، قاہرہ سے شائع کر چکے ہیں، آج کل دیوان بشار بن برد کی ترتیب و تہذیب میں مصروف ہیں۔ بشار کے مکمل دیوان کا دنیا میں وجود نہیں۔ مولانا نے بڑی محنت سے مختلف ماخذوں اور مصدروں سے بشار کے اشعار ڈھونڈھ کر جمع کئے ہیں، جن کی تعداد ڈیڑھ دو ہزار تک پہنچتی ہے۔ ابھی حال میں دیوان بشار کے ایک نسخے کا پتہ چلا ہے جو ناقص الاول ہے، یہ نسخہ ٹیونس میں ہے اور زیتونیہ یونی ورسٹی کے چانسلر محمد طاہر بن عاشور کی ملکیت ہے انھوں نے مولانا کی کتاب شرح مختار کے مطالعے کے بعد ہی ڈاکٹر کرنکو کو اپنے نسخے کی اطلاع دے دی تھی۔ مولانا نے علامہ شیخ خضر حسین جمعیۃ الہدایۃ الاسلامیہ اور پروفیسر احمد امین صدر لجنۃ التالیف کے ذریعے اس نسخے کا روٹو گراف منگوانے کا انتظام کر لیا ہے۔

یہ امر باعث مسرت ہے کہ شعبۂ عربی کے دو سابق طالب علم آج کل امریکا، اور مصر میں اعلیٰ تعلیم میں مصروف ہیں ڈاکٹر سید محمد یوسف ام۔اے پی ایچ ڈی (علیگ) جنھوں نے علامہ عبدالعزیز المیمنی کی زیر ہدایت "مہلب بن ابی صفراء" پر کام کیا ہے، اب جامعہ فواد اول (قاہرہ) میں اردو زبان کے استاد ہیں اور وہیں ڈاکٹریٹ کے لئے عرب و ہند کے تعلقات پر ایک تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں۔

دوسرے طالب علم نبی بخش بلوچ ام اے (علیگ) جو یہاں "سندھ، عربوں کے تحت۔ متوکل تک" پر کام کر رہے تھے، آج کل کولمبیا یونی ورسٹی میں زیر تعلیم ہیں اور وہاں تعلیمات کے کئی امتحانات امتیازی طور پر پاس کر چکے ہیں اور بہت جلد "ڈاکٹر آف ایڈ کیشن" کی ڈگری لے کر واپس آ رہے ہیں۔

ڈاکٹر خورشید احمد فارق ام اے۔ پی ایچ ڈی (علیگ) جنھوں نے زیاد ابن ابیہ پر ریسرچ کیا تھا آجکل دہلی کالج (سابق عربی کالج) میں استاد ہیں اور کئی علمی تالیفات میں مصروف۔ ان کا تحقیقی مقالہ اور "تاریخ ادب عربی" اشرف اینڈ کو لاہور جلد ہی شائع کرنے والے ہیں، "تاریخ ادب عربی" ڈاکٹر صاحب نے بڑی عرق ریزی سے مرتب کی ہے اور یقین ہے کہ یہ کتاب ہمیں نکلسن اور دوسرے مغربی مصنفین کی تاریخوں سے بے نیاز کر دے گی

اس سال مجتبیٰ حسن صاحب ام اے (علیگ) "اردو، ان میں عربی الفاظ، ان کے تبدیل شدہ معانی اور ان کی صورتیں" پر ریسرچ کر رہے ہیں، وہ اپنا کام جلد ہی ختم کرنے والے ہیں۔

شعبۂ فارسی ۔ سال گزشتہ اس شعبہ میں خالد عمر صاحب اور سید خلیق نقوی صاحب ریسرچ کر رہے تھے۔ ان صاحبوں کے موضوع علی الترتیب یہ ہیں۔ (۱) "فارسی کے ملک الشعراء دربار مغلیہ میں" (۲) "قدسی، تذکرہ و تبصرہ" "مولانا ضیاء احمد بدایونی، فیضی اور اس کے عہد" پر کام کر رہے ہیں۔

شعبۂ اردو ۔ شعبۂ اردو میں نو اساتذہ ہیں اور سب کے سب علمی و ادبی کاموں میں مصروف ہیں۔

رشید احمد صدیقی ۔ ہمارے نگراں اور استاد رشید احمد صدیقی کی شعبے کے اندر بے حد مصروفیات ہیں، شعبے کے اندر اس وقت سات آٹھ اساتذہ ریسرچ کر رہے ہیں اور ان سب کے کاموں کی نگرانی اور دیکھ بھال تنہا انھیں کی ذات کرتی ہے اس کے علاوہ شعبے کے اندر جو کچھ کام ہوتا ہے اور وہاں کے اساتذہ جو کچھ لکھتے ہیں وہ بہت کچھ رشید صاحب کی وجہ سے ہے، ہمارا خیال ہے کہ ہندستان کی بیشتر یونی ورسٹیوں کے شعبۂ اردو کا کام اور صرف ہمارے شعبۂ اردو کا کام مجموعی طور پر برابر ہی ہوگا۔ اس عدیم الفرصتی کے باوجود رشید صاحب کچھ نہ کچھ کرتے

دو ڈاکٹر سے "معارف" میں شائع ہو چکے ہیں۔ کئی غزلیں بھی آپکی معارف میں شائع ہوئی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ [illegible] کے سلسلہ تاریخ اسلام پر بھی ایک کتاب زیر ترتیب ہے۔

ظہیر الدین علوی صاحب۔ مقالوں اور نظموں سے زیادہ [illegible] کر رہے ہیں، جامعہ اردو کا سارا کام انھوں نے [illegible] پر لے لیا ہے، اور [illegible] اس کی بقا و ترقی کے خیال میں [illegible] نظر آتے ہیں، فرصت مل جاتی ہے تو تحفۃ الشعراء [illegible] بھی ہیں۔ [illegible] غزلیں سنا دیتے ہیں، اور کبھی کبھی [illegible] رشک [illegible] کی جیسی بھی لکھ دیتے ہیں۔

[illegible] آج کے زمانے میں [illegible] اہم موضوع بن گیا ہے، ہر شعبے میں [illegible] کے لئے نفسیات کا [illegible] ضروری سا ہو گیا ہے [illegible] پیدا کرنے کے لئے علم النفسیات [illegible] قیمت ضروری ہے، ہمارے شعبے کے [illegible] استاد اس طرف [illegible] ہیں ڈاکٹر مسعود حسین خاں [illegible] میاں محمد شریف ایم اے (کیمبرج) کی نگرانی میں نفسیات میں ڈاکٹریٹ کے لئے ایک مقالہ [illegible] میں اس کا عنوان ہے "شاعری [illegible] نظریات کا [illegible]" اردو میں لسانیات ان کا خاص موضوع ہے اور اس پر گہری نظر رکھتے ہیں مضامین لکھتے کافی ہیں [illegible] شائع ہوتے ہیں، ریڈیو سے تقریریں نشر کی ہیں، منظومات میں نظم [illegible] گیت [illegible] کچھ لکھے ہیں آجکل اردو میں ایک نظم [illegible] ہیں، جو شاید [illegible] کی طویل ترین نظم ہوگی۔

انور انصاری۔ اردو اور فلسفے میں علی گڑھ سے ایم اے ہیں، علم کی پیاس [illegible] آجکل وہ لسانیات کی تعلیم کیلئے جامعہ کلکتہ تشریف لے گئے ہیں۔

ابو الليث صدیقی۔ حدیث ہے "اطلبوا العلم ولو كان بالصين" (علم حاصل کرو چاہے چین ہی جانا پڑے) کیوں نہ سہی، [illegible] عربوں کے لئے چین اور [illegible] علوم کی خاص اہمیت ہو لیکن آجکل علم کا محور یورپ ہے۔ ہمارا معیار عربی و فارسی اور اردو لٹریچر [illegible] ڈاکٹر صاحب بھی تعلیم کیلئے یورپ تشریف لے گئے ہیں جہاں وہ جامعہ لندن میں لسانیات پر کام کریں گے۔

شعبۂ فلسفہ۔ جناب عمر الدین صاحب ایم اے (علیگ) صدر شعبۂ فلسفہ، شعبہ کی نشو و نما میں کافی دلچسپی [illegible] کا ثبوت دے رہے ہیں۔ وہ صحت کی خرابی کے باوجود علمی کاموں میں مصروف نظر آتے ہیں، ابھی [illegible] انگریزی کتاب غزالی کے فلسفۂ اخلاق پر شائع کی ہے۔ جہاں ڈاکٹر ظفر الحسن، میاں محمد شریف، ڈاکٹر [illegible] محمود صدیقی کا [illegible] اس شعبے میں کچھ سے اساتذہ کی آمد ہمارے لئے باعث مسرت ہے۔ [illegible] صدیقی صاحب ڈاکٹر ظفر الحسن کے خاص تلامذہ میں ہیں اور [illegible] کالجوں میں استاد کی حیثیت سے شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ اقبال پر ان کی نگاہ بہت گہری ہے۔ شہاب الدین محمد صاحب بی اے (آنرز) ایم اے (علیگ) ڈاکٹر ظفر الحسن اور میاں محمد شریف دونوں کے فیض حاصل کیا ہے اور وہ فلسفہ اور [illegible] دونوں مضامین سے دلچسپی رکھتے ہیں، فلسفے میں ایم اے ہیں اور عملی نفسیات کا کام ابھی جامعہ کلکتہ میں ہندوستان کے مشہور ماہر نفسیات [illegible] کی نگرانی میں کر کے آئے ہیں "اقبال کا مابعد الطبیعات" کے مصنف ڈاکٹر عشرت حسین جو چین میں حکومت ہند کی طرف سے چینی فلسفہ پر ریسرچ کر رہے تھے ان دنوں اسی شعبے میں استاد ہو کر آگئے ہیں یہ تینوں اساتذہ ہمارے قدیم طالب علم ہیں، ہم ادارہ کی طرف سے انھیں خوش آمدید کہتے ہیں۔ اسی سال سٹر ڈے کا [illegible] عمل میں آیا ہے [illegible] نفسیات و مسائل پر گہری نظر رکھتے ہیں، زمانہ حاضرہ کی ضروریات کو دیکھتے ہوئے اس سال نفسیات میں ایم اے کی کلاس کھول دی گئی ہے۔ شعبے میں اس وقت چار اصحاب ریسرچ کر رہے ہیں۔ [illegible] احمد صاحب [illegible] صدیقی، اقبال کا فلسفۂ تصوف پر کام کر رہے ہیں، ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا موضوع شاعری کے نفسیاتی نظریات کا تنقیدی جائزہ ہے۔ محمد [illegible] صاحب سر سید کے علم کلام پر کام کر رہے ہیں اور آنسہ جمیلہ خاتون ایم اے (علیگ) "اقبال کے فلسفے میں انسان، خدا، اور کائنات" پر ڈاکٹریٹ کے لئے مقالہ لکھ رہی ہیں۔ آنسہ قمر جہاں نامی ایم اے (علیگ) نے گزشتہ سال عمر الدین صاحب کی کتاب "امام غزالی کا فلسفۂ اخلاق" کا بہترین شستہ اردو میں ترجمہ کیا۔ شعبے کی طرف سے یہ مفید ترجمہ شائع ہو جائے تو بہتر ہے۔

فلاسفیکل سوسائٹی۔ ظفر احمد صدیقی صاحب کی نگرانی میں قائم ہے، ہر پندرھویں روز مضامین پڑھے جاتے ہیں۔ اس سال ۲۲ مقالے پڑھے [illegible] فہرست شائع ہوچکی ہے، پچھلے سال پروفیسر حبیب الرحمن ٹریننگ کالج نے "پروپگنڈے کی نفسیات" پر، محمود اقبال نے فاشزم کے فلسفہ پر اور آنسہ جمیلہ خاتون نے "اقبال کے مرد کامل" پر مضامین پڑھے اور مسٹر ڈونلڈسن نے غزالی کی اخلاقیات پر تقریر کی۔ اس سال الٰہیات کے تجربات [illegible] ظفر احمد صدیقی اور شہاب الدین محمد مغنی صاحبان نے کئے۔ محمود اقبال نے "اقبال بحیثیت مفکر و شاعر" ایک مقالہ پڑھا۔

کامرس ڈپارٹمنٹ۔ میڈیکل کالج کی طرح کامرس کالج بھی جامعہ کی شدید ضروریات سے ہے اور قوم کو اس کی جس قدر شدید حاجت ہے [illegible] مخفی نہیں۔ ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم نے صرف ایک شعبے کے طور پر جناب ایس۔ ایم شفیع صاحب کی سرکردگی میں اس کا آغاز کردیا تھا۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ شفیع صاحب نے اس شعبہ کی توسیع و ترقی اور اس کی بنیادیں مضبوط کرانے میں کسی طرح کی کمی نہیں کی۔ انھوں نے اپنی ان تھک محنت اور جفاکشی سے اس شعبے کو اس قدر ترقی دی ہے کہ اگر یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد صحیح معنوں میں اس سے دلچسپی لیں اور طلبہ کا ذوق و شوق اسی طرح بڑھتا رہا تو وہ دن دور نہیں جب شفیع صاحب کے ہاتھوں یہ شعبہ کامرس کالج کی شکل میں تبدیل ہو جائے گا۔ گذشتہ سال کے نتائج دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آئی کام میں طلباء پچاس فی صدی اور بی کام میں ۴۲ ۹۷ فی صدی کامیاب ہوئے ہیں یعنی ۱۸ طلبا میں ۱۷ کامیاب ہوئے۔ ہم اس نتیجے پر جس قدر بھی شفیع صاحب کو مبارکباد دیں کم ہے۔ اس سال [illegible] طلباء کی مجموعی تعداد ۱۴۳ ہے شعبۂ کامرس میں ایک سوسائٹی بھی ہے اور اس کا اپنا ایک رسالہ "جرنل آف کامرس" دو سال سے نکل رہا ہے۔ ہم اپنے نئے شیخ الجامعہ سے اس بات کی پرزور سفارش کریں گے کہ اس شعبے کو جس قدر ترقی دے سکیں دینا چاہیئے اس لئے کہ اس وقت قوم اور ملک کو اس شعبہ کی سخت ضرورت ہے۔

کچھ میگزین کے بارے میں۔ علی گڑھ میگزین ایک سہ ماہی رسالہ ہے اور جنگ سے پہلے سال میں بالعموم اس کے تین چار نمبر نکل جاتے تھے، اس طرف جب سے دوسری جنگ کا آغاز ہوا کاغذ کمیاب بلکہ نایاب ہو گیا، کاغذ کے ساتھ ساتھ دوسرے سامان طباعت کی گرانی اس قدر ہوش ربا رہی کہ گزشتہ چھ سات سال سے یہ معمول سا ہو گیا ہے کہ سال بھر میں صرف ایک نمبر نکل کر رہ جاتا ہے جو ضخامت کی ایک حد تک تلافی ضرور کر دیتا ہے لیکن طلباء کے ذوق کی تسکین کسی طرح نہیں ہوتی۔ جنگ کو ختم ہوئے ایک عرصہ گزر چکا ہے لیکن کاغذ بازار میں اب بھی عنقا ہے، کنٹرول ریٹ پر بھی کاغذ نہیں ملتا ہے اس لئے کہ ہمارے پاس حکومت کا عطا کردہ پرمٹ نہیں ہے، اور بازار میں جو نرخ ہے اس نرخ پر ہم ۴ اشاعتوں کے لئے کاغذ خریدیں تو ہمارا سارا فنڈ ختم ہو جائیں اور کتابت و طباعت کے لئے ایک پیسہ بھی باقی نہ رہے ہم نے ہر ممکن کوشش کی کہ متعدد نمبر نکال سکیں لیکن ہم اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ابتدا میں اسی ارادے کے تحت [illegible] جزو کی طباعت بھی کرائی گئی تھی لیکن پریس کی انتظامات اس زمانے میں اسقدر درہم برہم تھے کہ ہم تو اس سال پرچہ نکالنے سے مایوس ہو چلے تھے، مہینوں وہ اجزا پیچھے پڑے رہے اور تاخیر اسقدر ہوتی گئی کہ کئی نمبر نکالنے کا خیال ترک کر دینا پڑا۔ میگزین اور مضامین کے معیار اور معنوی خوبی کے بارے میں ہم کچھ کہنا نہیں چاہتے اور نہ ہم انشا کے لفظوں میں "اپنا مال چھپڑ کر [illegible]" کے قائل ہیں۔ ظاہری حسن کے متعلق ہمارا ذوق جس قدر مجروح ہوا ہے اور جو اذیت ہمیں پہنچی ہے اس کے بیان کے لئے دفتر درکار ہے۔ مختصر یہ کہ اس "مدینۃ العلم" میں ایک بھی ڈھنگ کا پریس ایسا نہیں جس میں [illegible] ستھری اور حسین طباعت ہو سکے۔ پرانے عملے میں جو لوگ تھے وہ پاکستان سدھار گئے۔ لیتھو کی طباعت ویسے بھی علاطت اپنے اندر لئے ہے، ٹائپ کا سرے سے یہاں وجود ہی نہیں، حیرت کا مقام ہے کہ آج سے [illegible] سال پہلے تو یہاں سے کتابیں اور سرسید کا پورا اخبار ٹائپ میں چھپے [illegible] اب اتنا سامان نہیں کہ ہم ایک صفحہ بھی ٹائپ میں شائع کر سکیں۔ ہم جب تک اس [illegible] کو سینے سے لگائے رہیں گے ہماری ناکامیوں کی داستان طویل ہوتی جائے گی۔

~~~

گزشتہ دسمبر میں میگزین کا آخری شمارہ محمود فاروقی صاحب کی ادارت میں شائع ہوا تھا، اس کے بعد اسکی ادارت جناب شجاع احمد زیبا صاحب کو تفویض کی گئی۔ وہ ابھی ابتدائی کام بھی شروع نہ کر سکے تھے کہ ان کے والد محترم کی طبیعت علیل ہو گئی اور وہ وطن تشریف لے گئے تھا ان کے قیام وطن کا سلسلہ طویل ہوتا گیا، اور جب اسی حیص بیص میں متعدد مہینے گزر گئے اور انکی واپسی کی امید نہ رہی تو رسالے کی ادارت کی پوری ذمہ داری راقم کے کمزور شانوں پر ڈال دی گئی۔ زیبا صاحب ہمیں چند مقالے اور کچھ نظمیں دے گئے تھے، انکی کتابت بھی کرالی گئی تھی لیکن ہم نے انکی محنت اور کوشش سے فائدہ اٹھانا مناسب نہ سمجھا اور ان مضامین کی اشاعت سے بچنے پر صبر کیا۔ دوسروں کی سوچی ہوئی راہ پر قدم [illegible] ہونا اور دوسروں کی بنیاد پر اپنی عمارت کھڑی کرنا ویسے بھی ہمیں پسند نہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ علیگڑھ میگزین ایک لائق ایڈیٹر سے محروم رہ گئی۔ ہمیں یقین ہے کہ زیبا صاحب اپنی جامعہ کے میگزین کو بھولیں گے نہیں اور کچھ نہ کچھ اس کے لئے ضرور لکھتے رہیں گے۔

احسان فراموشی ہوگی اگر ہم اس موقعے پر اپنے استاد اور نگراں رشید احمد صدیقی صاحب کی محبت و شفقت اور ان کی مہربانیوں کا ذکر نہ کریں، ساتھ ہی ساتھ ہم اپنے لائق منظم، سید ظہیر الدین علوی صاحب کے بھی مدل ممنون ہیں جنھوں نے ہر طرح کی آسانیاں ہمارے لئے بہم پہنچائیں بقیہ اردو کے اساتذہ میں ہم اختر انصاری صاحب، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، خورشید الاسلام صاحب، [illegible] صاحب کے ممنون ہیں کہ انھوں نے بیش بہا مفید مشورے دیئے۔

ادارے کے لوگوں میں ہم محمد الدین [illegible] کے ممنون ہیں کہ انھوں نے میگزین کے نصف اجزا کے پروف پڑھے پنڈت نہرو کے خطبے کی پہلی سطروں کا ترجمہ کیا اور بعض دوسرے پریس کے کاموں میں ہاتھ بٹایا، نفیس احمد ترمذی نے خط و کتابت اور ترسیل میگزین کا کام اپنے ذمے لیا اور اقبال انصاری نے میگزین کا دفتر درست کرنے میں ہمارا ہاتھ بٹایا ہم ان سب صاحبان کے ممنون ہیں۔

مختار الدین احمد آرزو

۲۰ نومبر ۴۸ء

ایم۔ اے۔ ایس۔ ایس۔ ڈی نمٹ (سرسید ہال)
~~~

ہمارے نئے شیخ الجامعہ

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں

ایس، ایم، شفیع

شعبہ کامرس کے صدر، اور سرسید ہال کے محبوب ترین پرووسٹ

اے آمدنت باعثِ آبادیٔ ما

یونیورسٹی کی حالیہ تاریخ کا سب سے اہم اور قابلِ ذکر واقعہ وائس چانسلری کے عہدے کے لئے جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب کا انتخاب ہے۔

مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری جیسے منصبِ وقیع کے لئے ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب جیسے برگزیدہ شخص کا انتخاب صحیح معنوں میں ایک عہد آفریں، اور ایک انقلاب انگیز واقعہ ہے۔ یہ ایک ایسا اقدام ہے جو بے حد وسیع اور پُرشکوہ امکانات اپنے اندر رکھتا ہے، جو بلا شبہ ہماری جامعہ کے دَورِ زریں کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ گزشتہ سال کی معروف سیاسی تبدیلیوں کے بعد ہمارے ملک کی تاریخ میں ایک نئے باب کے صفحات منتقل ہو چکے ہیں۔ سیاسی انقلاب اور اس کے عقب میں رونما ہونے والے تہلکات و تغیرات نے عقیدتوں اور قدروں کی دنیا کو اُلٹ پلٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ نقطہ ہائے نظر اور زاویہ ہائے فکر بدل چکے ہیں اور بدل رہے ہیں۔ اس بحران اور عمرانیاتی خلفشار نے انڈین یونین کے باشندوں میں مسلمانوں کو سب سے زیادہ شدت کے ساتھ متاثر کیا ہے۔ سلجھے ہوئے دماغ اور واضح سیاسی تصورات رکھنے والے اصحاب نہ پہلے تاریکی میں تھے نہ اب ہیں۔ مگر عام مسلمان جو گزشتہ چند سالوں سے سیاسی نعروں کی رَو میں بہنے کے عادی رہے ہیں آج اپنے غلط قسم کے جذباتی سہاروں سے محروم ہو کر بُری طرح اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ متضاد کیفیات اور متحارب میلانات نے اُن کو ایک شدید کشمکش اور ذہنی پیکار میں مبتلا کر رکھا ہے۔ مسلم یونیورسٹی جو ایک طویل مدت سے مسلمانوں کی تمدنی، تعلیمی اور ثقافتی زندگی کا مرکزِ ثقل بنی رہی ہے اور جس کو آج پہلے سے بھی زیادہ وضاحت اور استقامت کے ساتھ اپنی رہنمایانہ خدمت انجام دینی چاہیئے تھی، خود اِس طوفان میں تھپیڑے کھاتی ہوئی ایک کشتی کی حیثیت رکھتی ہے۔ وجہ ظاہر ہے خود یونیورسٹی اب تک صحیح قسم کی رہنمائی اور مقتدر قوم پرست اصحاب کے تعاون و تائید سے محروم رہی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی تشریف آوری اِس خلا کو بطرزِ احسن پُر کرتی ہے۔ یقیناً اِس وقت یونیورسٹی کو ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب جیسی شخصیت کی ضرورت تھی۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن کا متوازن سیاسی مسلک، اُن کی پختہ اور [illegible] ہوئی علمیت، اُن کا بے پایاں تعلیمی تجربہ، اُن کی فراخ دِل کُشا انسانیت اور تمام دوسری گرامی قدر صفات نہ صرف یونیورسٹی بلکہ عام مسلمانوں کی زندگی کے حق میں مسیحائی کا کام کریں گی۔

اِس حکایتِ لذیذ کا لذیذ ترین جزو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب ہمارے اور یونیورسٹی کے لئے نئے یا اجنبی ہرگز نہیں ہیں۔ وہ اسی ادارے کے پُرانے فرزند ہیں اور آج اُن کا شمار اُن چند ممتاز اور عظیم القدر ہستیوں میں ہوتا ہے جن کی پیدائش اور تعمیر و پرداخت کا فخر علی گڑھ کو حاصل ہے۔ ہم ڈاکٹر صاحب کے انتخاب پر اُن کی خدمت میں سعادت مندانہ اور صمیمانہ ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں اور اُن کے ورودِ مسعود کو اپنی کشائش اور خوش بختی کا مژدہ خیال کرتے ہوئے خود اپنے کو بھی کچھ کم لائقِ مبارکباد نہیں سمجھتے۔

قائد اعظم

قائد اعظم کی وفات کسی ایک شخص یا ایک قوم کے لئے نہیں، بلکہ ایک پورے دور کے لئے سانحہ کا حکم رکھتی ہے۔ وہ عظیم تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں، ان کی منطق بے پناہ تھی، ایک دنیا اس کی قائل ہے، وہ غیر متزلزل ارادے کے مالک تھے، ان کا سیاسی کارنامہ اس پر گواہ ہے۔ ان کے طوفان میں تصوّر، پندار میں جلال اور جوش میں جرأت تھا۔ ان کی عظمت میں ایک قوم کے روز و شب کی جھلک تھی۔ قائد اعظم نے آزادی کی جنگ میں حصہ لیا اور کبھی پیچھے نہیں رہے۔ ان کی دوستی اور دشمنی اُصولی تھی، دوست اور دشمن دونوں کو ان سے خبردار رہنا پڑتا تھا۔ وہ آگے بڑھنے میں نہ موانع دیکھتے تھے نہ مصلحت کو خاطر میں لاتے تھے۔ مفاہمت کے دل دادہ نہ تھے، وہ [illegible] تناور درخت تھے جس کے سایے میں آرام ممکن تھا، حفاظت بھی، لیکن اُبھرنے کا اکثر اندیشہ [illegible]! حالات اور اشخاص ان کے ہاتھ میں کھلونا تھے، وہ حالات اور اشخاص پر اتنا اعتماد نہ کرتے جتنا اپنے آپ پر۔ انھوں نے جو کچھ کیا وہی کر سکتے تھے۔ انھوں نے ایک ریاست قائم کر دی جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی، اس طرح انھوں نے ایک تاریخ بھی بنا دی۔

اس تاریخ کے کچھ اوراق ابھی سادہ ہی تھے اور بعض کے نقوش بھی پورے طور پر اُبھرنے نہ پائے تھے کہ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کی شب کو وہ اپنے مورّخوں سے منھ موڑ کر اپنے خالق کے حضور میں جا پہنچے۔

خدا ہندستان اور پاکستان کو ہم نوا و ہم دم بنائے، اور دونوں حکومتیں ایک دوسرے ہی کے لئے نہیں، تمام عالم کے لئے موجب خیر و برکت ہوں۔ دعا ہے کہ خدا مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ بخشے، اور ان کی تربت پر رحمت کے پھول برسائے، آمین!

(ح)

قائداعظم

محمد علی جناح

عربک سوسائٹی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سنہ ۳۸-۱۹۳۷ء

(بیٹھے ہوئے دائیں سے بائیں) مہتدی حسن (رسرچ اسسٹنٹ) ڈاکٹر خورشید احمد فارق (جونیر لکچرر) پروفیسر عبدالعزیز میمن
(صدر شعبۂ عربی) مختار الدین احمد آرزو (نائب صدر سوسائٹی) نواب محمد اسمٰعیل خاں (وائس چانسلر) محمد مسعود صدیقی
(سیکریٹری) ڈاکٹر عابد احمد علی (ریڈر) مولانا ندر الدین علوی (سینیر لیکچرر) خورشید حسن ایم اے (فائنل)

خونِ شفق

ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے

گاندھی جی

تیس جنوری کی شام، ہندستان اور ایشیا ہی نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ کی سیاہ ترین شام تھی، اس تاریخ کو عدم تشدد کا دیوتا، اہنسا کا پجاری، ایک رندے کے ہاتھوں ہم سے ہمیشہ کیلئے جدا کر دیا گیا۔

گاندھی جی کے کارنامے سورج کی طرح روشن و تاباں ہیں، اس دبلے پتلے، نحیف ولاغر انسان نے چوتھائی صدی تک ہندستانیوں کے دلوں پر حکومت کی ہے، سنگینوں کے زور سے نہیں بلکہ محبت شفقت اور مسحور کن طاقتوں کے ذریعے۔ وہ برسوں برطانوی سیاست دانوں سے لڑتے رہے صرف سچائی اور عدم تشدد کے بل بوتے پر۔ انھیں بظاہر کمزور اور بے جان ہتھیاروں سے مسلح ہو کر انھوں نے دنیا کی سب سے بڑی شہنشاہیت سے ٹکر لی، اور آج دنیا جانتی ہے کہ اس معرکے میں جیت کس کی رہی۔

گاندھی جی کی ذات مختلف و متنوع صفات کی سنگم تھی، انھوں نے انسانی خامیوں، کمزوریوں اور خرابیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی، انسانی عظمت کے تاج محل بھی تعمیر کئے اور محبت و خلوص کا ایلورا اور اجنتا بھی تراشے۔ اسی مادی دنیا میں انھوں نے ایک روحانی دنیا بھی پیدا کر لی تھی، ایک ایسی دنیا جس میں مادیت کے بازو مفلوج اور تشدد کے اعضا مسلوب نظر آتے ہیں اور روح اپنی تمام مسخرانہ قوتوں کے ساتھ انسانی دلوں اور دماغوں پر قبضہ و تصرف حاصل کر لیتی ہے۔

گاندھی جی کی شخصیت و عظمت کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں تھی، ان کی شخصیت وہی ہے جس نے انھیں عظمت بخشی، گاندھی جی اگر شہید نہ ہوتے تو ان کی عظمت نامکمل رہتی، اگر پہلے وہ عظیم تھے تو اب وہ عظیم تر ہیں۔

گاندھی جی کا پیغام، کسی ایک ملک یا قوم تک محدود نہ تھا، بلکہ آفاقی اور کائناتی تھا، انکی عمر بھر کی جد و جہد میں کسی مخصوص جماعت یا فرقے کا مفاد نہیں، بلکہ سارے زمانے اور کل بنی نوع انسان کی فلاح مضمر تھی انکی شخصیت تاریخ عالم کو ایک طوفانی اور ظلمت آفریں دور میں انسانیت کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کے لیے منارۂ روشنی کا حکم رکھتی تھی۔ غرض یہ کہ ان کی زندگی، وقت اور مقام کی حدود سے بالاتر تھی اور اسی طرح سارے زمانوں اور مقامات میں گھل مل کر تحلیل ہو گئی تھی۔

گاندھی جی کا فانی جسم، زمین کی وسعتوں اور آسمان کی پہنائیوں میں گھل مل گیا ہے، وہ سمندر کی تہوں اور آگ کے شعلوں میں تحلیل ہو گیا ہے، لیکن صدیاں بیت جانے کے بعد بھی جب انکے خاکی جسم کی یاد کے نقوش، دلوں کی لوح پر مدھم پڑ جائیں گے ان کی روح کی سکونت بخش روشنی سے سارا جہان منور اور شاد نظر آئے گا۔ (مرتب)

ناظمہ بیگم

گاندھی جی کی اُردو تحریریں

آج ان بدلتے ہوئے حالات میں جو کچھ بھی کہا جائے، لیکن سچی بات یہ ہے کہ گاندھی جی اردو زبان اور اُردو رسم الخط کے مخالفوں میں نہ تھے، بلکہ انھوں نے بارہا اُردو زبان اور رسم الخط دونوں کی حمایت کی، ان کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ہندی سیکھیں اور سب ہندو جو ملک کی خدمت کرنی چاہتے ہیں اُردو لکھیں، یہ ان کا صرف قول اور پیغام ہی نہ تھا بلکہ اس پر انھوں نے عمل کر کے بھی دکھا دیا اور ایک بار جب وہ جیل گئے تو اس فرصت سے فائدہ اُٹھا کر انھوں نے اُردو سیکھ لی۔ اُردو سیکھنے کے بعد ایک روایت کے مطابق پہلا اُردو خط انھوں نے بیگم عبدالحمید جو ابیہ کے نام لکھا تھا، افسوس یہ ہے کہ وہ خط ہمیں نہ مل سکا ورنہ میں گاندھی جی کی سب سے پہلی اُردو تحریر آپ کے سامنے پیش کر سکتی۔

حضرت احسن مارہروی نے اپنے ایک مضمون میں ذکر کیا ہے کہ گاندھی جی نے بندے ماترم کے ایڈیٹر کے نام سنہ ۱۹۲۴ء میں ایک خط اُردو میں لکھا تھا اُس کی دو سطریں یہ ہیں :۔

”تلک مہاراج نے آدھے اشلوک میں ہند کو سکھایا کہ سوراجیہ ہمارا حق ہے اگر ہم ان کے بھگت ہیں تو کھدر پوش بن کر سوراج حاصل کر کے اپنی بھگتی کا ثبوت دیں۔“

سنہ ۱۹۲۴ء ہی میں ایک اردو خط انھوں نے مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام لکھا تھا جسے بھائی عبدالماجد نے شروع کیا تھا۔

گاندھی جی کی تحریر کے جو نمونے ہمارے پیش نظر ہیں آیئے اُن پر ایک سرسری نظر ڈال لیں۔

(۱) حسنین سید، جامعہ ملیہ دہلی سے رسالہ ”جوہر“ کا اقبال نمبر شائع کر رہے تھے انھوں نے گاندھی جی سے اس نمبر کے لئے پیام مانگا تھا۔ گاندھی جی کا یہ رقعہ اسی کے جواب میں ہے۔

(۲) یہ رقعہ ۲۶ دسمبر سنہ ۳۹ء کو گاندھی جی نے انجمن ترقی اُردو کے اجلاس سنہ ۳۹ء کے موقعہ پر مولانا عبدالحق کو لکھا تھا۔

(۳) ۱۳ ستمبر سنہ ۴۱ والی تحریر انھوں نے بی بی سلطانہ کو لکھی ہے، بی بی سلطانہ سے مراد سلطانہ قاضیہ بیگم ہیں جو حیات اللہ انصاری صاحب کی بیوی ہیں، یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ حیات اللہ اور ان کی بی بی دونوں گاندھی جی کی بے حد معتقد ہیں۔ گاندھی جی سے ان کے خاندان سے اچھے تعلقات تھے، رقعوں کے اندراجات سے اسکی تصدیق ہوتی ہے۔

(۴) یہ تحریر بھی جو ردی کاغذ کے دو ٹکڑوں پر مشتمل ہے بہن سلطانہ قاضیہ بیگم سے متعلق ہے، انھوں نے ایک مرتبہ سنہ ۱۹۴۲ میں گاندھی جی سے شکایت کی کہ آپ نے کہا ہے کہ ”اردو مسلمانوں کی زبان ہے وہ چاہیں تو رکھیں اور چاہیں تو مٹا دیں۔“ بہن سلطانہ جس دن اُن سے ملیں وہ ان کی خاموشی کا دن تھا۔ سلطانہ کی شکایت پر انھوں نے یہ سطریں لکھی تھیں، جس میں انھوں نے اس بات کی تصریح کی کہ ”یہ قول غلط طور پر میری طرف منسوب ہے، میں نے کبھی یہ نہیں کہا ہے، پریس والے بات کو توڑ مروڑ کر پیش کر دیتے ہیں۔“

(۵) اس خط کے مکتوب الیہ بھائی حیات اللہ انصاری کے دادا خسر قاضی نجم الدین احمد صاحب (اندر کوٹ میرٹھ) ہیں گاندھی جی اور قاضی صاحب سے خلافت کے زمانے کے مراسم چلے آتے تھے، گاندھی جی گُڑ بڑے شوق سے کھاتے تھے، قاضی صاحب نے اُن کو میرٹھ کا گُڑ تحفے کے طور پر بھیجا تھا، اس کے ساتھ خط انگریزی میں لکھا تھا، گاندھی جی کو یہ بات کچھ پسند نہ آئی، گاندھی جی کا یہ رقعہ اسی کا جواب ہے جس میں انھوں نے قاضی صاحب کو اُردو خط و کتابت کی طرف متوجہ کیا ہے۔

گاندھی جی نے اردو بڑھاپے میں سیکھی تھی، پھر سیاسی اور دوسری مصروفیات کے باعث انھیں اُردو میں لکھنے کا زیادہ موقعہ نہ مل سکا اسی لیے اُردو رسم الخط میں کچا پن نمایاں ہے۔ گاندھی جی کی تحریر میں املا کی بھی بعض غلطیاں مل جاتی ہیں۔ انھوں نے ان معاملا پر اتنی توجہ بھی نہ دی ہوگی، ان کا کمال یہی تھا کہ اس عمر میں انھوں نے اپنے کو ایک نئی زبان لکھنے پڑھنے پر آمادہ کر لیا اور اس میں کامیاب بھی ہوئے، ان خطوط کا مطالعہ، گاندھی جی کے ان نام نہاد فدائیوں کے لئے سرمہ بصیرت کا کام دیگا جو اردو زبان اور اردو رسم الخط دونوں کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔

SEGAON. WARDHA.

(۱) مورخہ ۹ر جون ۱۹۳۸ء

بھائی محمد حسین۔

آپ کا خط ملا۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم کے بارے میں میں کیا لکھوں؟ لیکن اتنا تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جب انکی مشہور نظم "ہندوستان ہمارا" پڑھی تو میرا دل اُبھر آیا۔ اور یارودہ جیل میں تو سینکڑوں بار مینے اس نظم کو گایا ہوگا۔ اس نظم کے الفاظ مجھے بہت ہی میٹھے لگے اور یہ خط لکھتا ہوں تب بھی وہ نظم میرے کانوں میں گونج رہی ہے

آپکا

مو. ک. گاندھی

بھائی صاحب

آپکا تار ملا تھا مجھے دکھ ہے
کی آپکے جلسے بیں میں حاضر نہیں
ہو سکتا ہوں۔ میری امید ہے کی
جلسہ ہر طرح کامیاب ہوگا
آپ جانتے ہیں کی میں اردو
زبان کی ترقی چاہتا ہوں۔ میرا
خیال ہے کی سب ہندو جو ملک کی
خدمت کرنا چاہتے ہیں اردو لکھیں
اور مسلم ہندی سیکھیں،

سیگاؤں
وردھا 12/36 27 کا گاندھی کا

(۴)

تم نے میری بہت دیکھیں تھی سچ بات یہ ھے کی میں نے کبھی ریا نہیں کہا ہے۔ مینے جو کہا تھا وہ چھپا ہے میں نکال کے بھیج سکتا ہوں کیا کیا جاے؟ اخبار دن میں میرے بارے میں بہت سے غلط باتیں لکھی جاتی ہے اگر کل تک رہنا ہے تو آجاو کچھ بات کرینگے اور کچھ سناونگا۔

اشعر ملیح آبادی

قتلِ انسانیت

کدھر بڑھے یہ کارواں —؟ یہ قافلہ چلے کہاں —؟
تمام وسعت فضائے ارض پر رواں دواں ہیں غم کی بدلیاں
اندھیری گھاٹیوں میں ناامیدیوں کی گم ہے زندگی —!

زمینِ ایشیا سے ایک "مردِ مومن" آج اٹھ گیا
وہ غیب داں، رازدانِ کائنات
مزاج داں شش جہات
وہ اپنے دل کے آئینے میں جام جم سے بڑھ کے صاف دیکھتا تھا عکسِ کائنات
وہ شمعِ بزمِ معرفت — وہ آگہی کی روشنی
وہ جس کی چشمِ پاک میں نئی جبلتوں سے کل تلک دھڑک رہی تھی زندگی
سیاستوں سے جس کی تھک گئے سفید قوم کے دماغ
دہانِ حلقہ ہائے رنگ خوردہ کھل گئے —!
جنہیں سے داغہائے لعنتِ غلامی دھل گئے —!
نئی شعاعیں ہند کے افق سے پھوٹنے لگیں —!!
جہاں میں جس کا نعرۂ "عدمِ تشدد" آج تک بار ہا نشانِ راہ
خود اُس پہ آج ظلم اور تشدد اپنا وار کر گئے —!
لئے ہوئے جبینِ تابناک پر طلوعِ آفتابِ عصرِ نو
سرشِ غیب آج حاکیوں کے دستِ خونچکاں سے گود میں عدم کی سو گیا —!!

وہ ہر نظر کا طور تھا
ہر ایک دل کا نور تھا
معلم و مدبر و مجاہد و غیور تھا
نفاق و شر کی آگ سے ہزاروں کوس دور تھا
فضیلتوں، بصیرتوں، محبتوں کا پیکرِ جمیل
بشر کی عظمتوں کا، رفعتوں کا سنگِ میل
لبوں کی جنبشوں میں سحرِ سامری نطقِ موسوی کی گم شدہ کرامتیں
دل و دماغ — اُس کی وسعتوں میں ایشیا کی عظمتِ کہن رہی جواں
ہزاروں تم خوردہ، مضمحل دلوں کو جس کے پاک نور نے دکھائی زندگی کی راہ
ہزاروں بن گئے نقوش جس کی آس پہ ابھر رہی تھی زندگی کی سیلِ تند و تیز میں
وہ آس ختم ہو گئی — وہ روشنی چلی گئی!!
پیمبرِ سکون، آشتی و اتحاد ایک دستِ تنگ ظرف و کم سواد سے فنا کا جام پی گیا —!!!

کدھر بڑھے یہ کارواں — یہ قافلہ چلے کہاں —؟
ہزاروں پرچم بلند اپنی نرم چھاؤں میں کھا رہے ہیں سبز باغ
تسلیاں سی دے رہے ہیں بے شمار نقشِ پا
مگر کسی کا اعتبار کیا —؟
ترے بغیر کون غم زدہ دلوں کا آسرا بنے —؟
مگر نہیں! یہ کس نے کہہ دیا کہ تیرا آسرا نہیں؟؟
امر ہے! جاوداں ہے تو!! فنا تری فنا نہیں!!
ترے پیام — تیرے زرنگار اُصول
ہنوز شمعِ راہ بن کے دیں گے حق پرستیوں کا درسِ جاوداں —!
ترے عمل کی روشنی سے جگمگا اٹھے گی کائنات —!!
انہیں شعاعوں کے سہارے کاروانِ زندگی بڑھے چلے —!!

اسرارالحق مجازؔ

تاجِ وطن کا لعلِ درخشاں چلا گیا

دردِ و غمِ حیات کا درماں چلا گیا — وہ خضرِ عصر و عیسیٔ دوراں چلا گیا

برہم ہے زلفِ کفر تو ایماں ہے سرنگوں — وہ فخرِ کفر و نازشِ ایماں چلا گیا

بیمارِ زندگی کی کرے کون دل دہی — نبّاض و چارہ سازِ مریضاں چلا گیا

کس کی نظر پڑے گی اب عصیاں پہ لطف کی — وہ محرمِ نزاکتِ عصیاں چلا گیا

وہ رازدارِ محفلِ یاراں نہیں رہا — وہ غمگسارِ بزمِ حریفاں چلا گیا

اب کافری میں رسمِ رہِ دلبری نہیں — ایماں کی بات یہ ہے کہ ایماں چلا گیا

اک بے خودِ سرورِ دل و جاں نہیں رہا — اک عاشقِ صداقتِ پنہاں چلا گیا

باچشمِ نم ہے آج زلیخائے کائنات — زنداں شکن وہ یوسفِ زنداں چلا گیا

ہے آرزو وہ چشمۂ حیواں پہ کر تلاش — ظلمات سے وہ چشمۂ حیواں چلا گیا

اب سنگ و خشت و خاکِ خدمت سربلند ہیں — تاجِ وطن کا لعلِ درخشاں چلا گیا

اب اہرمن کے ہاتھ میں ہے تیغِ خوں چکاں — خوش ہے کہ دست و بازوئے یزداں چلا گیا

دیوِ بدی سے معرکۂ سخت جاں سہی — یہ تو نہیں کہ زورِ جواناں چلا گیا

کیا اہلِ دل میں جذبۂ غیرت نہیں رہا — کیا عزمِ سرفروشیٔ مرداں چلا گیا

کیا باغیوں کی آتشِ دل سرد ہو گئی — کیا سرکشوں کا جذبۂ پنہاں چلا گیا

کیا وہ جنونِ جذبۂ بیدار مر گیا — کیا وہ شبابِ حشر بداماں چلا گیا

خوش ہے بدی جو دام یہ نیکی پہ ڈال کے
رکھ دیں گے ہم بدی کا کلیجہ نکال کے

اٹھو کہ نو بہار ہے
جوش ملیح آبادی

جوش ملیح آبادی

۱۷
۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء

اُٹھو کہ نو بہار ہے

بڑھو کہ رقص و رنگ ہے، اٹھو کہ نو بہار ہے

پہلی آواز

وطن کے روئے پاک پر ہے آب و رنگ سروری
قلندروں کے جام میں ہے بادۂ تونگری
شکوہ بحرِ ہند کا، ہمالیہ کی برتری
وطن کے طول و عرض کی پیمبری و داوری
ہجوم در ہجوم ہے، قطار در قطار ہے
بڑھو کہ رقص و رنگ ہے، اٹھو کہ نو بہار ہے

نشانِ صولتِ وطن مچل رہا ہے کوہ پر
دمک رہے ہیں بام و در، چھلک رہے ہیں بحر و بر
چمک رہی ہے زندگی، چھلک رہا ہے جامِ زر
چلیں نہ رند کس لیے زمیں پہ سینہ تان کر
کہ آج حریت کا گلے میں تازہ ہار ہے
بڑھو کہ رقص و رنگ ہے، اٹھو کہ نو بہار ہے

سنا رہی ہے زندگی سرور کی کہانیاں
مچل رہی ہیں عصرِ نو میں تازہ کامرانیاں
برس رہی ہیں عرش سے رسیدہ شادمانیاں
ابل رہی ہیں فرش سے دمیدہ نوجوانیاں
روش روش نکھار ہے، چمن چمن سنگار ہے

حیات نو کے زمزمے ہیں کوئے مے فروش میں
حواس میں زمیں ہے نہ آسمان ہوش میں
ترنگ ہے شباب پر، امنگ ہے خروش میں
اٹھاؤ جامِ زرفشاں کہ بانگِ نا و نوش میں
ہزار ہے، چنار ہے، نگار ہے، ملار ہے
بڑھو کہ رقص و رنگ ہے، اٹھو کہ نو بہار ہے

دوسری آواز

یہ بیونت اور یہ کتر، یہ کانٹ چھانٹ ابتری
شناوروں کی ڈبکیاں، مجاہدوں کی بے پری
یہ کوہکن کی کپکپی، یہ پیرزن کی تھرتھری
لباسِ بذل و جود میں چھپی ہوئی یہ قیصری
شگفتہ برگ ہائے گل کی تہ میں نوکِ خار ہے
خزاں کہیں گے پھر کسے، اگر یہی بہار ہے
یہ مقبلوں کی دشمنی، یہ مفلسوں کی جاں کنی
یہ امن سوز شیخیت، یہ کینۂ برہمنی
بدی، برائی، بے رخی، بگاڑ، بحث، بدظنی
کشیدگی، رمیدگی، عناد، بغض، دشمنی

عجب کا خلفشار ہے، بلا کی گیر و دار ہے
خزاں کہیں گے پھر کسے، اگر یہی بہار ہے

قتالِ خون و جنگ ہے، جنونِ قہر و جبر ہے
گرج ہے بات بات میں فسادِ شہر شہر ہے
فضا میں رقصِ مرگ ہے، زمیں پہ موجِ زہر ہے
سپاہیوں کا زور ہے، تباہیوں کی لہر ہے
کماں میں سرِ حرب ہے، کمیں میں شہریار ہے
خزاں کہیں گے پھر کسے، اگر یہی بہار ہے

یہ لعنتیں، یہ رشوتیں، یہ "نگڑ بال" یہ چوریاں
یہ شرمناک چوریاں، اور اس پہ سینہ زوریاں
سبک گراں فروشیاں، ذلیل نفع خوریاں
ادھر خلا ہے بھوک کا، ادھر بھری ہیں بوریاں
نہ پیٹ میں نوالہ ہے، نہ تن پہ ایک تار ہے
خزاں کہیں گے پھر کسے، اگر یہی بہار ہے

ادھر مہا مہنت ہیں، ادھر کبیر امام ہیں
وہ تنگیوں میں مست ہیں، یہ دعوتوں میں جام ہیں
مہاجنوں کے جال ہیں، ریاستوں کے دام ہیں
عوام کا شمار کیا، عوام کالانام ہیں
مویشیوں میں آج تک عوام کا شمار ہے
خزاں کہیں گے پھر کسے، اگر یہی بہار ہے

تیسری آواز

یہاں یہ وقتِ جشن ہے، مناظرہ سے فائدہ
محلِ رقص و وجد ہے کہ راستہ تو پا لیا
فضا سے ابر چھٹ گیا، ہوا کا رخ بدل گیا
جو دل میں ہے حبیب تو کیا بلا ہے کربلا
وہ کل بنے گی برگِ گل جو آج نوکِ خار ہے
بہار پھر بہار ہے، بہار پھر بہار ہے
بہک کے جو بچھڑ گئے ہیں راستے پہ آئیں گے
تڑپ کے ایک دوسرے کو پھر گلے لگائیں گے
بہم کہ حریف تھے، یہ بات بھول جائیں گے
کھلیں گے، گنگنائیں گے، ہنسیں گے، مسکرائیں گے
یہ آرزوئے دہر ہے، یہ حکمِ روزگار ہے
بہار پھر بہار ہے، بہار پھر بہار ہے
اٹھو دریچہ کھل گیا وہ منزلِ فراز کا
وہ غزنوی کے قصر میں دیا جلا ایاز کا
سرا ملا وہ عقدہائے گیسوئے دراز کا
چمن پہ رنگ چھا گیا وہ چشمِ نیم باز کا
رقیب غم نصیب ہے، حبیب غم گسار ہے
بہار پھر بہار ہے، بہار پھر بہار ہے

اٹھو کہ اس زمین کو ہم آسماں بنائیں گے
عمارتوں کو پھونک کر، امارتوں کو ڈھائیں گے
نشیب کو ابھار کر، فراز کو جھکائیں گے
سفینۂ بحر نور میں غرور سے چلائیں گے
اگرچہ اپنے گرد و پیش آج موج نار ہی
بہار پھر بہار ہی، بہار پھر بہار ہی
ہماری جستجو میں ہیں رواں، جہاں پناہیاں
فلک کی شہریاریاں، زمیں کی کج کلاہیاں
ہم اور لب طلبی ولی یہ دل شکن حماہیاں

ہر اک قدم پہ ہیں تو ہوں تباہیاں، سیاہیاں
تباہیوں سیاہیوں میں صبح زرنگار ہی
بہار پھر بہار ہی، بہار پھر بہار ہی
ارے بتاؤ کون ہی یہ زندگی کا نغمہ خواں
یہ کس کے دل کی گونج سے لرز رہا ہی آسماں
یہ کس کا حرف گرم ہی، ستارہ بار و مہ چکاں
ارے یہ کون بھر رہا ہی، ولولوں کی بجلیاں
یہ شاعر حیات ہی، یہ جوش بادہ خوار ہی
بہار پھر بہار ہی، بہار پھر بہار ہی

کچھ اس طرح سے بہار آئی ہی کہ بجھنے لگے
ہوائے لالہ و گل سے چراغ دیدہ و دل
رواں ہی قافلۂ بے درا و بے مقصود
جو دل گرفتہ ہیں راہی تو رہنما غافل
یہ اضطراب، یہ شوق عروس آزادی
اٹھا کے دیکھ تو لینا تھا پردۂ محمل
یہ بات کہ کے ہوا ناخدا الگ مجھ سے
یہ ہے سفینہ، یہ گرداب ہی، وہ ہی ساحل
سنا رہا ہوں برنگ غزل زمانے کو
حکایت غم دوراں، فسانۂ غم دل

حفیظ ہوشیارپوری

علی سردار جعفری

جشن آزادی

میں کہ صدیوں کی سرگوشیاں سن چکا ہوں
کتنے سربستہ رازوں کو سینے کے اندر چھپائے ہوئے ہوں
کتنے پر ہول المناک افسانوں کو اپنے دل میں دبائے ہوئے ہوں

کتنے ہی جشن کتنی ہی عیدیں
میری یادوں کے دامن میں محفوظ ہیں
ظلم اور جبر کی خون بھری داستانیں
بادشاہوں کی جنگی حکایات

دیو پریوں کے قصّے کہانی
انقلاب اور بغاوت کے دلکش ترانے

میرے ہونٹوں پہ سوئے ہوئے ہیں
میں انھیں جب بھی چاہوں جگا لوں —
مجھ کو معلوم ہیں ماٹل ڈینوا کے کھنڈر
وہ فرات اور دجلے کی موجیں جنھیں لوریاں دے رہی ہیں
کس لیے آج ویراں ہیں
ان میں ان مطلق الحکم شاہوں کے ایوان تھے
جن کے ہونٹوں کی جنبش
موت کی ہم زباں تھی
ساحلِ نیل پہ وہ ابوالہول سکتے کے عالم میں اب تک کھڑا ہے

مصر کے سربلند آسماں بوس اہرام مبہوت ہیں
علم و تہذیب کی اس پرانی زمیں پر
سر پھرے اور مغرور فرعون چھائے ہوئے تھے
جو خدا بن کے انسانوں کو لوٹتے تھے۔

اور وہ یونان کے قصر ہیں
روم کے اونچے اونچے ستوں ہیں
وہ بھی اک داستاں کہہ رہے ہیں
ان کے سایہ میں بردہ فروشی کے بازار تھے
جن میں انسان انسان کو بیچتا تھا۔
وہ سمرقند کے سبز گنبد
اور بخارا کے ایواں ہیں
جن پہ خونخوار تاریوں کی اڑائی ہوئی گرد بیٹھی ہوئی تھی
اُف یہ چنگیز اور تیمور کی عیش گاہیں
ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے کچلی ہوئی آدمیت کی
مظلوم چیخوں سے گونجی ہوئی تھیں۔
اور وہ باسٹیل کے قید خانے کی دیواریں
جن کی اینٹیں شرابی زناکار جاگیرداروں پہ بھی کھول کر
ہنس رہی ہیں

ان کے لوہے کے در پر کلیساؤں کے پادری پاسباں تھے
وہ اسیروں کو جنت کے پروانے اور مغلوں کو
صبر و شکر و سکون اور روحانیت کا سبق دے رہے تھے۔
اور وہ ماسکو کا کریملین ہے۔
جس کے ماتھے کا روشن ستارہ
سرخ کرنوں کی تنویر برسا رہا ہے
اس کے اندر ابھی کل تلک
روس کے زار کھیتوں اور کارخانوں کے مالک روئی فولاد
تیل اور بارود کے بین الاقوامی بیوپاری بیٹھے ہوئے سازشیں
کر رہے تھے لہ۔
میں صدیوں کی سرگوشیاں سن چکا ہوں
آج دلی کی آواز بھی سن رہا ہوں
جس کے سینہ پر ظالم فرنگی حکومت کا ایک بوجھ رکھا ہوا تھا
آہ! یہ میری اپنی ہی آواز ہے
میرے اہلِ وطن کے دلوں کی صدا ہے
جو ہمارے گلوں میں
ایک زخمی پرندے کی مانند
ڈیڑھ سو سال تک پھڑپھڑاتی رہی ہے۔
اب نہ وہ بابل و نینوا کے شہنشاہ ہیں
اور نہ وہ مصر کے سرپھرے اور مغرور فرعون ہیں
اور نہ روم و یوناں کے بردہ فروش
اور نہ خونخوار چنگیز و تیمور
اب نہ باستیل کے پاسباں
اور نہ وہ روس کے زار ہیں
اور نہ دلی کے خود سر فرنگی
صرف ان کے مظالم کی اک خون بھری داستاں رہ گئی ہے

(۲)

آج دلی کی کھوئی ہوئی رفعتیں اس کو پھر مل گئی ہیں
اس کا مکھڑا خوشی سے دمکنے لگا
جس کی تنویر سے ایشیا جگمگایا ہوا ہے۔
کتنے ہی تخت دیکھے ہیں اس نے
کتنے ہی تاج پہنے ہیں اس نے
اس کے سینے پر کتنے ہی شاہوں کے نقشِ قدم ہیں
کتنی تہذیبیں کتنے تمدن
اس کی آغوش میں سو رہے ہیں
کتنے ٹوٹے ہوئے آفتاب اور مہتاب
اس کے کھنڈروں میں بکھرے پڑے ہیں
کتنے ہی گیت کتنے ہی نغمے
اس کی شاخوں میں الجھے ہوئے ہیں
اس کے ماتھے پہ سورج بھی چمکا
چاند جگمگایا

لہ ماخوذ از مارل سینڈ برگ (دلسے دیکا)

جشن آزادی

غم کی گھنگھور کالی گھٹائیں بھی چھائیں
دکھ کی راتیں بھی بیتیں
سکھ کی صبحیں بھی آئیں
یہ مگر اک نئے عہد کی اک نئی نسل کی منتظر تھی۔
میری دلی
میری محبوب دلی
اب تو غاصب شہنشاہوں کی داشتہ اور خود کام جاگیرداروں
کی لونڈی نہیں ہے
غیر ملکوں کے سرمایہ داروں کی منڈی نہیں ہے
تو ہماری امیدوں کا مرکز، خوابوں کی تعبیر ہے
آرزوؤں کی تصویر ہے۔
تیرے چہرے پر میں آج اک نور سا دیکھتا ہوں
جیسے تیری جبیں پر کروڑوں ستارے سمٹ آئے ہیں۔
یہ اشوک اور اکبر کے عہد حکومت کی تنویر ہرگز نہیں ہے
بلکہ جمہور کی مشعلوں کی ضیا ہے۔
دیکھ ہندوستان کے کروڑوں سپوتوں کی نظریں
آج تیری طرف اٹھ رہی ہیں
یہ ہماری نگاہوں کی کرنیں ہیں جو تیرے رخ پر نور کا
جال سا بن رہی ہیں
روٹیوں کے لیے کتنے سوکھے ہوئے ہاتھ پھیلے ہوئے ہیں
کتنے ننگے بدن ایک کپڑے کے ٹکڑے کی خاطر کھڑے ہیں
ان کو نفرت سے ان کو حقارت سے مت دیکھ
یہ فقیر اور بھکاری نہیں ہیں
تیرے ہندوستان کے بہادر سپاہی ہیں جو انقلاب اور بغاوت
کی بھڑکی ہوئی آگ میں جل چکے ہیں
ننگی تلواروں کی دھار پر چل چکے ہیں
یہ تیری مملکت کے طرفدار ہیں
تیری قسمت کے معمار ہیں
تیری آزادی کے پاسبان ہیں
یہ ان ہی کے رگوں کا لہو ہے
تیرے ماتھے پر جو آج رنگ شفق اور ہتھیلی پر رنگ حنا بن گیا ہے

(۳)

جاگ ہندوستاں اب خواب گراں سے
دیکھ آزادی کی صبح کا نور پھیلا ہوا ہے
تیرے برسوں کے بچھڑے ہوئے لال گھر آ رہے ہیں
یہ غلامی کی زنجیر کو توڑ آئے
قید خانوں کے در کھول آئے
اپنی آغوش میں ان کو بڑھ کر اٹھا لے
اپنے دل میں سنبھالے
یہ ہمالہ ہے یہ سندھیا چل یہ نیلگری
یہ تیرے کھیت ہیں تیرے کھلیان ہیں
تیری کانیں ہیں یہ باغ ہیں یہ تیرے کارخانے

یہ تیرے سبز و شاداب میدان یہ ہنستی ہوئی وادیاں ہیں
یہ تیری صاف و شفاف بہتی ہوئی ندیاں
تیری گودوں کی پالی ہوئی بیٹیاں ہیں
ان کو اپنے گلے سے لگا لے
تو اپنے پاکیزہ آنچل کے نیچے چھپا لے
دیکھ یہ اپنے خوں میں کمیں ہیں
تیرے لاکھوں شہیدوں کی روحیں کھڑی ہیں
جو تجھے تہنیت دے رہی ہیں
ان کی آنکھیں مسرت کے اشکوں سے نمناک ہیں
لیکن ان کے گریبان ابھی چاک ہیں
ان کو اپنی محبت سے سی دے

(۴)

ڈیڑھ سو سال کے بعد ہندوستان کا علم آج پھر کھل رہا ہے
پرچموں سے لہو کھل کے انگڑائیاں لیں
فوجیں اپنی شکستہ صفوں کو جمائیں
فتح اور کامرانی کے ڈنکے بجائیں
توپیں ہندوستان کی سلامی اتاریں
اور طیاروں کو حکم دو
آسمانوں پہ جھپٹیں
اپنے مضبوط فولاد کے شہپروں کو ذرا آزمائیں
چاند تاروں کو آکاش سے توڑ لائیں

کشتیاں اپنے لپٹے ہوئے بادباں کھول دیں
اور جہاز اپنے لنگر اٹھائیں
سینۂ بحر سے شاہی جھنڈا ہٹا کر
اپنے جمہوری جھنڈے اڑائیں۔
بچے گہواروں میں کھلکھلا کر ہنسیں
مائیں اشکوں سے بھیگے ہوئے آنچلوں کو سکھائیں
دیویاں مانگ میں اپنی سیندور بھریں
بیبیاں اپنے ہاتھوں پر افشاں لگائیں
ناچیں ناچیں اجنتا کی شہزادیاں
اور ایلورا کی پریاں
اپنی صدیوں کی خاموشی کو توڑ کر گیت گائیں
[illegible] پیا کی کلیاں
[illegible]
[illegible] ہمالہ کی [illegible]وں میں بہتے ہوئے سرخ دلکش کنول
[illegible]یلی پہ رنگیں شمعیں جلائیں
وادیاں مسکرائیں
کھیتیاں لہلہائیں
کوہسار اپنے سینوں کی دولت نکالیں
آبشار اپنی قوت دکھائیں
کانیں اپنے خزانوں کے در کھول دیں
اور ہندوستان کے قدم پر

اپنے لعل و جواہر نچھاور کریں
آہنی کارخانوں سے کہہ دو
اپنے پہیوں کی رفتار کچھ تیز کر دیں
اور نغموں کے طوفان اٹھائیں

(۵)

آسماں پر چمکتے ہوئے صبحِ آزادی کے سرخ سورج
تو ہمیں دور سے کس لئے دیکھتا ہے
آ ہماری زمیں پر اُتر آ
تیرے سینہ میں وہ روشنی اور حرارت نہیں ہے
جو ہمارے دلوں میں
تیرے ماتھے پر رنگِ شفق ہے
اور ہماری جبیں پر ہمارے شہیدوں کا خوں ہے
روشنی تیری کرنوں کی سطحِ زمیں تک
اور ہماری نگاہوں سے دل کے کنول جل رہے ہیں
تو فقط صبحِ نو کا پیمبر
ہم نئے عہد کے ترجماں ہیں
اپنے آکاش کے اونچے آسن پر بیٹھے ہوئے دیوتا
تو کروڑوں برس سے
اپنی ہی آگ میں جل رہا ہے
ایک ہی راہ پر صبح سے شام تک شام سے صبح تک
چل رہا ہے
آ ہماری زمیں پر اُتر آ
دو گھڑی ہند کے سبزہ زاروں میں آرام کر لے
اپنی جھولی کو پھولوں سے بھر لے
اور اپنے سفر پر چلا جا
مجھ کو معلوم ہے ایشیا اور یورپ کی راتیں
تیرے انوار کی منتظر ہیں
جا اور اُن کو نئے نور سے جگمگا دے
ان کی گردن میں ہندوستاں کے چمن کے مہکتے ہوئے
تازہ پھولوں کے گجرے پہنا دے!!

وہ ایک تم ہو کہ تکمیلِ جلوہ پر نازاں
وہ ایک میں کہ تصور بھی کامیاب نہیں
حریمِ ناز کے پردے تمہیں مبارک ہوں
نگاہِ شوق کو مجبوریِ حجاب نہیں — آرزو

معین احسن جذبی

نیا سورج

بڑے ناز سے آج ابھرا ہے سورج　　ہمالہ کے اونچے کلس جگمگائے
پہاڑوں کے چشموں کو سونا بنایا　　نئے بل نئے زور اُن کو سکھائے
لباسِ زری آبشاروں نے پایا　　نشیبی زمینوں پہ چھینٹے اُڑائے
گھنے اونچے اونچے درختوں کا منظر　　ہیں آج سب آبِ زر میں نہائے

مگر ان درختوں کے سایے میں اے دل
ہزاروں برس کے یہ ٹھٹھرے سے پودے
ہزاروں برس کے یہ سہمے سے پودے
یہ پودے جو آج بھی سرد بے حال بے دم
یہ پودے جو آج بھی اپنے سر کو جھکائے

ارے او نئی شان کے میرے سورج　　تری آب میں اور بھی تاب آئے
ترے پاس ایسی بھی کوئی کرن ہے؟
جو ایسے درختوں میں بھی راہ پائے
جو ٹھٹھرے ہوؤں کو جو سہمے ہوؤں کو
حرارت بھی بخشے گلے بھی لگائے

۲

بڑے ناز سے آج ابھرا ہے سورج　　ہمالہ کے اونچے کلس جگمگائے
فضاؤں میں ہونے لگی بارشِ زر　　کوئی نازنیں جیسے افشاں چھڑائے

دمکنے لگے یوں خلاؤں کے ذرّے کہ تاروں کی دنیا کو بھی رشک آئے

ہمارے عقابوں نے انگڑائیاں لیں سنہری ہواؤں میں پر پھڑپھڑائے
فسردوں تر ہوا نستہ کامرانی تجسس کی آنکھوں میں ڈورے سے آئے
قدم چومنے برق و باد آب و آتش بصد شوق دوڑے، بصد عجز آئے
مگر برق و آتش کے سایہ میں اے دل
یہ صدیوں کے خود رفتہ ناشاد طائر
یہ صدیوں کے پر بستہ برباد طائر
یہ ہیں آج بھی مضمحل، دل گرفتہ
یہ ہیں آج بھی اپنے سر کو چھپائے
ارے او نئی شان کے میرے سورج تری آب میں اور بھی تاب آئے
ترے پاس ایسی بھی کوئی کرن ہے؟
انھیں بخت تیز سے جو بچائے۔
انھیں جو نئے بال و پر آ کے بخشے
انھیں جو نئے سر سے اڑنا سکھائے

۱۵ اگست

سحر قریب سہی شب کا آخری لمحہ

جلو میں اپنے لیے ہے ہزار ہا ظلمات ملیح الدین

خلیل الرحمٰن اعظمی

صبح آزادی

ابھی ہیں آس لگائے یہ زیست کی راہیں
کبھی تو غم کے چراغوں سے پھول برسیں گے

یہ دھوپ چھاؤں، یہ ہلتے ہوئے حسیں پردے
یہ اک غبار سا چھایا ہوا فضاؤں پر
یہ آرزوؤں کی دنیا میں سرمئی بادل
ہے ایک نیند سی طاری ابھی ہواؤں پر

ابھی تو اُن کی طرف سے پیام آیا تھا
ابھی تو کان میں گونجے تھے دور کے نغمے
مگر فضا میں یہ کیوں ہیں سکوت کی لہریں
طویل خواب میں شاید ہیں آج ویرانے

کبھی کبھی تو امیدوں کا جال ٹوٹا ہے
مگر نگاہ میں پھرتی رہی وہ اک تصویر
دلِ حزیں نے پرانے غموں سے اکتا کر
بنا لی اپنی محبت کی اک نئی تقدیر

وہ جھنڈ بے تصورِ نقشے نکھر رہی تھی فضا
وہ جگمگائے تھے قلب و نظر کے بت خانے
مگر یہ بڑھ چلی کیوں آنکھ کی یہ حیرانی
یہ آ رہے ہیں نظر اب بھی یوں وہی چہرے

نئے افق سے وہی آفتاب نکلا ہے
وہی ہے خواب جوانی وہی نگاہ دلیل
یہ سوچ میں دل مجبور ہے کہ اب کیا ہو
تلاش کر لے کوئی ان جفاؤں کی تاویل

بہت دنوں سے ہیں لرزاں یہ اجنبی سائے
مگر وہ چشم عنایت ہے ہم پہ اب بھی
ہزار بار خون وفا ہوا عریاں
مگر وہ حسن دو عالم ہے ایک راز ابھی

۲

ابھی غموں میں نمایاں ہے زندگی کا فریب
ابھی تو راہ میں حائل ہے ایک پردۂ رنگ
مگر بہ منزل جاناں ہوائے وادیٔ شوق
سکوت میں ہے لیے آج اک نیا آہنگ

دھوئیں کی گود میں سوتا ہے اب بھی رقصِ شباب
ہوس نے سازِ جوانی پہ گیت گائے ہیں
دعائے نیم شبی، یہ طلسم آہوں کا
ابھی تو ذہن پہ تاریکیوں کے سائے ہیں

فروغِ حسن وہ صہبائے آتشیں کا گداز
ضیائے ماہ میں اب بھی نزولِ شبنم ہے
اگرچہ دیدنی ہے گیسوؤں کی آرائش
مگر ابھی تو مری کائنات برہم ہے

مسرتوں کو نیا آئینہ دکھانا ہے
ابھی جہاں میں لہو کے چراغ جلنے دو
اِن آنسوؤں ہی سے نکھرے گی شاہراہِ حیات
ابھی تو تند ہے طوفاں مجھے سنبھلنے دو

ذوقِ نظر کی زد میں ہیں دونوں جہاں کی ظلمتیں
گُل نہ کرو چراغ ابھی اپنے حریمِ ناز کا

(آرزو)

س ح

فریب آزادی

ناگہاں شور ہوا
وشب تارِ غلامی کی سحر ہوتی ہے
بجلیاں جاگ اٹھیں
بربط و طاؤس نے انگڑائی لی
اور مطرب کی ہتھیلی سے شعاعیں پھوٹیں
کھل گئے ساز میں نغموں کے مہکتے ہوئے پھول
لوگ چلائے کہ فریاد کے دن بیت گئے۔
راہزن ہار گئے
راہبر جیت گئے

قافلے دور تھے، منزل سے بہت دور، مگر
خود فریبی کی گھنی چھاؤں میں دم لینے لگے۔
چن لیا راہ کے روڑوں کو خزف ریزوں کو
اور سمجھ بیٹھے کہ بس لعل و جواہر ہیں یہی
راہزن ہنسنے لگے چھپ کے کمیں گاہوں میں

ہم نشیں یہ تھا فرنگی کی فراست کا طلسم
ہر قوم کی ناکارہ قیادت کا فریب
ہم نے آزردگیٔ شوق کو منزل جانا
اپنی ہی گردِ سرِ راہ کو محمل جانا
گردشِ حلقۂ گرداب کو ساحل جانا

اب جدھر دیکھو ادھر موت ہی منڈلاتی ہے
در و دیوار سے رونے کی صدا آتی ہے
خواب زخمی ہیں امنگوں کے کلیجے چھلنی
میرے دامن میں ہیں زخموں کے دہکتے ہوئے پھول
خون میں لتھڑے ہوئے پھول
میں جنہیں کوچہ و بازار سے چن لایا ہوں
قوم کے راہبرو! راہزنو!!
اپنے ایوانِ حکومت میں سجا لو، ان کو
اپنے گلدانِ سیاست میں لگا لو ان کو

اپنی صد سالہ تمناؤں کا حاصل ہے یہی
موجِ پایاب کا ساحل ہے یہی

تم نے فردوس کے بدلے میں جہنم لے کر
کہہ دیا ہم سے گلستاں میں بہار آئی ہے
چند سکوں کے عوض چند ملوں کی خاطر
تم نے ناموس شہیدان وطن بیچ دیا
باغباں بن گئے تھے اور چمن بیچ دیا

طوق خود ہم نے پہنا رکھا ہے ارمانوں کو
اپنے سینہ میں جکڑ رکھا ہے طوفانوں کو
اب بھی زندان غلامی سے نکل سکتے ہیں
اپنی تقدیر کو ہم آپ بدل سکتے ہیں

۲

کون آزاد ہوا ؟
کس کے ماتھے سے غلامی کی سیاہی چھوٹی ؟
میرے سینہ میں ابھی درد ہے محکومی کا
مادر ہند کے چہرے پہ اداسی ہے دہی

ہم کہاں جائیں کہیں کس سے کہ نادار ہیں ہم
کس کو سمجھائیں غلامی کے گنہگار ہیں ہم

۳

آج پھر ہوتی ہیں زخموں سے زبانیں پیدا
تیرہ و تار فضاؤں سے برستا ہے لہو
راہ کی گرد کے نیچے سے ابھرتے ہیں قدم

تارے آکاش پہ کمزور جوانوں کی طرح
شب کے سیلاب سیاہی میں بہے جاتے ہیں
پھوٹنے والی ہے مزدور کے ماتھے سے کرن
سرخ پرچم افق صبح پہ لہراتے ہیں۔

اور اس پار بھڑکتے ہیں فضا میں شعلے
شور و ہنگامہ ہے برپا افق عالم پر
ہم نشیں ! مقتل ہستی کو ذرا غور سے دیکھ
جس کو بیکار سمجھتا ہے زمانہ وہ کہیں

دیکھنا ! ہم نفسو ! یہ کوئی گلزار نہ ہو
یہ کسی طائر فردوس کی جھنکار نہ ہو
کہیں اس پردۂ خوں میں کوئی گلکار نہ ہو
لیلیٰ امن کا دہکا ہوا رخسار نہ ہو

یہ قیامت سی اٹھاتی ہوئی دنیا کی روش
کسی معشوقۂ طناز کی رفتار نہ ہو

اختر انصاری

جگر مرادآبادی

آجکل

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آجکل

سازِ حیات، سازِ شکستہ ہے ان دنوں
بزمِ خیالِ جنت ویراں ہے آجکل

انسانیت کہ جس سے عبارت ہے زندگی
انساں کے سایہ سے بھی گریزاں ہے آجکل

آنکھیں تمام مشہدِ عشق و جمال ہیں
سینہ تمام گنجِ شہیداں ہے آجکل

دل کی جراحتوں سے کھلے ہیں چمن چمن
اور اس کا نام فصلِ بہاراں ہے آجکل

جس کا ہے نام زیست وہ مشکل ہے ان دنوں
کہتے ہیں جس کو موت وہ آساں ہے آجکل

دہلی و دہرہ دون و نواکھالی و بہار
انساں ہے اور ماتمِ انساں ہے آجکل

جمہوریت کا نام ہے جمہوریت کہاں
شیطانیت حقیقتِ عریاں ہے آجکل

خلاق ایک فن ہے جو عصرِ جدید میں
اندازِ حسن فن کے نمایاں ہے آجکل

سونی پڑی ہے روحِ صداقت کی انجمن
چہرہ منافقت کا گلستاں ہے آجکل

کیسا خلوص، کس کی محبت، کہاں کا درد
خود زندگی متاعِ گریزاں ہے آجکل

جو تھا زبان پر وہ ہوا بن کے اڑ گیا
جو دل میں تھا حقیقتِ عریاں ہے آجکل

کانٹے کسی کے حق میں کسی کو گل و ثمر
کیا خوب اہتمامِ گلستاں ہے آجکل

ہر زخمِ کائنات جو ہندو ہے ان دنوں
ہر داغِ زندگی جو مسلماں ہے آجکل

شائستگی کے بھیس میں روحِ درندگی
انسان کے لباس میں شیطاں ہے آجکل

کچھ رہبرانِ خاص جو مخلص ہیں واقعی
اُن کا چراغ بھی تہِ داماں ہے آجکل

اس سے تو خودکشی ہی غنیمت ہے اے جگر
جو مصلحت کہ پیشۂ مرداں ہے آجکل

سے لیا ہے "بندگان والا شان خداوند مکرم و مطاع معظم حضرت مولوی امام شہید مدظلہ العالی" (نثر صفحہ ۵) ۱۲۷۴ھ میں ذکا غالب کے شاگرد ہوئے (نثر ۱۱۹) غالب نے اپنے بعض خطوں میں ذکا کو شہید سے متعلق توہین آمیز الفاظ لکھے۔ بے خبر کو جو غالب اور شہید دونوں کے دوست تھے اس کا علم ہوا تو بظاہر انھوں نے غالب سے اس کی شکایت کی۔ غالب صاف مکر گئے:

"مولوی صاحب سے میری ایک ملاقات ہوئی تھی جب وہ دلی آئے تھے ... اور ملاقات سے اس دن تک کہ حضرت دکن روانہ ہوں کوئی امر ایسا کہ باعث نااتفاقی کا ہو درمیان نہیں آیا ... اگر خدا نخواستہ رنج پیدا ہوتا تو آپ بہت جلد اصلاح بین الذاتین کی طرف متوجہ ہوتے جیسے منشی حبیب اللہ کا میں نے ان کو دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹیں تین چار برس ہوئے کہ ناگاہ ایک صاحب اکبر آباد سے آیا کہ میں تلمذ اختیار کرتا ہوں بریلی اور لکھنؤ اور کلکتہ اور بمبئی اور سورت سے اکثر حضرات نظم و نثر بھیجتے رہتے ہیں ہر ایک کا پایہ فن شعر میں معلوم ہو جاتا ہے ... عدم ملاقات ظاہر ہے کہ سب میں کیا جانوں؟ ذکا کے اشعار آتے رہے اور میں اصلاح دے کر بھیجتا رہا بعد وارد ہونے مولوی صاحب کے ایک غزل ان کی آئی اور انھوں نے یہ لکھا کہ شہید اکبر آبادی کی غزل پر غزل لکھتا ہوں میں نے لکھا کہ مولانا شہید اکبر آباد کے نہیں لکھنؤ ... الہ آباد کے ہیں اس سے زیادہ کوئی بات میں نے نہیں لکھی اس سے توہین کے معنی مستنبط ہوں تو میں اس کا متہم ہوں اب یہ نہیں پاتا کہ ... صاحب نے مولوی صاحب سے کیا کہا اور مولوی صاحب نے آپ کو کیا لکھا" (عود ہندی ص ۶۷ اور اردو ص ۳۱۲) ذکا کے نام کے مطبوعہ خطوں میں کوئی ایسا نہیں جس میں شہید کے وطن کی بحث ہو، گو یہ ممکن ہے کہ غالب نے ذکا کو کسی خط میں اس بات کے متعلق لکھا ہو اور وہ خط نہ چھپا ہو۔ قابل اعتراض خط وہ ہیں جن کی ضروری عبارتیں ذیل میں نقل کی جاتی ہیں:

"اب سنتا ہوں کہ مولوی غلام امام شہید شاگرد تفتیل وہاں کو ہیں اور دلاغیری بجا رہے ہیں اور سخن ناشناسوں کو اپنا زور طبع دکھا رہے ہیں۔ ایک شخص مجھ سے کہتا تھا کہ مختار الملک نے منہ نہ لگایا مگر محی الدولہ نے چار سو روپے مہینا سرکار جناب عالی سے مقرر کرا دیا ہے۔" (اردو صفحہ ۳۷۹)

---

۵ کلیات شہید مطبوعہ کا دیباچہ بے خبر نے لکھا ہے

(۲) مولوی غلام غوث خاں بے خبر مخلص خالص الاخلاص ہیں ہرگز ان کو مدعی سے تلمذ نہیں البتہ اس کو خوشگو جانتے ہیں اور یہ کبھی نہ ہوگا کہ وہ میرا مقابلہ کریں ... باطل است آنچہ مدعی گوید۔ مدعی اپنے زعم میں مجھ کو اپنا ہم فن جان کر حسد کرتا ہے میں اپنے رتبہ میں شرح ملا محتسب اور مولوی جامی جیسا مفتی کہاں سے لاؤں جو نیاز کرے اور کاذب کو میرے ... [illegible] ... یقین ہے کہ قلمرو ہند میں اور بھی ایسے آدمی ہوں گے کہ میرے اور ... [illegible] ... کس کے مصرع:

عید است بادہ شد فلک و ساغر آفتاب

نہ معلوم فلک ظرف اور آفتاب مظروف ہو ... ظرف کو مظروف اور مظروف کو ظرف ٹھہراتا ہے ... اس سے بڑھ کر ایک اور حماقت یہ ہے کہ مشبہ اور مشبہ بہ میں وجہ شبہ شرط ہے آفتاب و ساغر میں تدویر وجہ شبہ ہے شراب اور فلک میں وجہ تشبیہ کہاں؟ (اردو صفحہ ۳۴۹)

پہلا خط ۱۸۶۳ء کا ہے اور دوسرا خط صفر سال مذکور یعنی ۱۲۸۰ھ کا ہے چونکہ بے خبر کو غالب نے یہ لکھا ہے کہ اس وقت ذکا کے تلمذ کو تین چار برس ہوئے ہیں اور انھوں نے ۱۲۷۸ھ میں تلمذ اختیار کیا تھا قرین قیاس یہ ہے کہ ۱۲۸۰ھ کے خط کی شکایت ہوئی ہوگی اس میں شہید کا نام نہیں آیا لیکن مدعی سے وہی مراد ہیں شہید نے کلب علی خاں کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا جو اُن کے کلیات (طبع اول صفحہ ۱۲۰) میں موجود ہے غالب نے مطلع کے پہلے مصرع پر اعتراض کیا ہے جو دراصل یوں ہے۔

عید است شیشہ شد فلک و ساغر آفتاب

اس کا دوسرا مصرع یہ ہے:

از بادہ آفتاب تراود در آفتاب

غالب نے 'شیشہ' کی جگہ 'بادہ' لکھا ہے ممکن ہے کہ انھوں نے اسی طرح سنا ہو یا بعد کو شہید نے مصرع میں اصلاح کر لی ہو مجھے حیرت اس پر ہے کہ ان خطوں کے لکھنے کے بعد غالب نے توہین آمیز الفاظ کے استعمال سے قطعی انکار کس طرح کیا۔ یہ خط اس کے بعد اردوئے معلی کے حصہ دوم میں چھپے ہیں اور اس وقت محفوظ ہوں گے شاید وہ یہ سمجھتے ہوں کہ ذکا آخر شاگرد ہیں یہ خط ان کے خلاف بہ طور ثبوت نہ پیش کیے جا سکیں گے اس کا

ایسا کوئی قطعہ جس کے قوافی آتیش، جیش اور عیش ہوں موجود نہیں یہ بات سوچنے کی ہے کہ اگر اشباع فتحہ ہوتا تو آتاش ہوتا آتیش ہونے کی کیا وجہ؟ فتحہ الف سے بدلتا ہے ی سے نہیں۔

(۵) غالب تیغ میں (ص۱۱) مصنف مؤید پر بڑی شد و مد سے اعتراض کرتے ہیں:

"مؤید کے پانچویں صفحے میں... مولوی جی ایک فقرہ لکھتے ہیں "غم گفتار ہاری زبان خورد" بھلا غم گفتار ہاری زبان خورد کے کیا معنی؟ غم مترتب ہوتا ہے ہلاک پر، قوت پر، گفتار کا غم کیا؟ پھر گفتار بھی زبان بھی یہاں مولوی کی فارسی دانی اور سخن رانی کی ٹھیک نکل گئی"۔

مصنف مؤید کے قلم سے ہرگز یہ فقرہ نہیں نکلا، یہ ان پر تہمت ہے انھوں نے "غم تباہی گفتار باری خورد" لکھا ہے جس پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ غالب شاید یہ سمجھے ہوں گے کہ اصل کتاب سے مقابلے کی زحمت کون گوارا کرے گا اور تردید ہوئی تو کیا ضرور ہے کہ تیغ کے کل پڑھنے والوں کی نظر سے گزرے، ان کی غرض مخالف کی تذلیل تھی اور وہ حاصل ہو گئی۔

(۶) غالب اسی کتاب میں (ص۱۴) مصنف مؤید پر سرقۂ مضمون، تغیر الفاظ کا جھوٹا الزام لگاتے ہیں:

"فقرے درفش کاویانی کے ۱۲ صفحے میں عبارت لکھی ہے: پیران پارس را قاعدہ چنان بود کہ بر سر دال ابجد نقطہ نہادندے چون دریں اندیشہ وجود دال بے نقطہ از میان می رفت و ہمہ دال منقوط می ماند اکابر عرب[۱۱] قاعدہ قرار دادند و تفرقۂ دال و ذال را بر آن قاعدہ اساس نہادند۔ منصفین ملاحظہ کریں کہ مولوی عربی خوان فارسی ندان مؤید کے ۴۴ صفحے میں یہ عبارت یوں لکھتا ہے: "بہ خاطر فاتر[۱۲] چنیں می رسد کہ چون در زمان قدیم و عہد باستان بزرگان بر دال نقطہ می نہادہ اند متاخرین کہ ازیں قاعدہ آگاہ نیند آن را خیال ذال منقوطہ کردہ اند" حضرات کو میں اس میں بہت تکلیف دوں گا اور بار طلبی میں اصرار و ابرام کروں گا۔ فرہنگہائے ہیتیس میں کوئی مجھ کو یہ مطلب دکھائے تو میں گنہگار، ورنہ مولوی اٹھائی گیرا۔ یہ راز مجھ سے حشمت مآب مخدوم مولانا و اولٰنا حضرت مولوی عبدالصمد علیہ الرحمۃ نے کہا ہے، کوئی دوسرا[۱۳] اس کو نہیں جانتا"

---

[۱۱] فارسی کے قواعد سے اکابر عرب کو کیا سروکار؟ صرف اتنی بات صحیح ہے... اور جو کچھ لکھا ہے غالب سے پہلے کہا جا چکا ہے[۱۴]۔

[۱۳] ترکے بعد مسودے کے اوراق جو غالب نے حذف کر دیا ہے ساری عبارت مؤید کے ص۴۳ پر ہے ص۴۴ پر نہیں[۱۴] اگر ایسی پرانی کتابیں موجود ہیں جن میں دال کو بالالتزام نقطے کے ساتھ لکھا جاتا ہے تو یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ عبدالصمد کے سوا کوئی دوسرا اس کو نہیں جان سکتا تھا؟"

تھا ایسی ہی بات کو چرانا اور اپنا قول بنانا چوری اور سرزوری خیرہ درائی اور بے حیائی ہو یا نہیں؟ مصرع: "اے اہل عقل کوئی تو بولو خدا لگی" جواب کا بہ ابرام طالب غالب

"عبارت کا مطلب مسروقہ بتایا جاتا ہو وہ صاحب مؤید کی نہیں صاحب فرہنگ کی ہے اور اس میں لفظ آدینش کے تحت واقع ہو (فرہنگ جلد ا ص) آغا احمد علی نے اس کے متعلق فرہنگ کی مکمل عبارت نقل کرنے سے پہلے یہ لکھ دیا ہی "صاحب جہانگیری شیرازی جہاں افادہ فرمودہ کہ" اور اس کے خاتمہ پر یہ الفاظ ہیں "تم افاضتہ" سرقے کا الزام، خواہ وہ فرہنگ سے ہو یا قاطع سے آغا پر کسی طرح عائد نہیں ہو سکتا۔

(۷) یہ بھی اسی کتاب میں ہی:

"درفش کاویانی کے ۵ اصفحے میں بحث تنبیہ دربارہ لغت آہنگ جو کچھ لکھا ہی خلاصہ اس کا یوں لکھا ہوتا:

"آہنگ را ماضی کشیدن قرار داد و برعایت توضیح لعلہٰ معنی کشید براں افزود و بس درفصل آہنگیدن آورد و گفت مصدر آہنگ ست کہ بہ معنی کشیدن باشد۔ بعد نقل عبارت برہان میں نے لکھا ہو کہ قاعدہ دانان صبغۃ للہ چون قاعدہ انتزاع ماضی برافگندن نون مصدر است ہر آئینہ ماضی آہنگید خواہد بود نہ آہنگ مولوی جہانگیر نگری نے مؤید برہان کے ۳۴ اور ۳۵ صفحے کو سیاہی سے لیپ دیا ہی بارہ معنی آہنگ کے لکھے اور ہر معنی کی سند میں ایک شعر... اس سے یہ معلوم ہوا کہ مولوی نے سب فرہنگوں کو دیکھ کر دس بارہ شعر نقل کیے ہیں یہ تو سب کچھ ہوا لیکن میرے اس فقرے کا جواب کہاں ہی کہ ہر آئینہ ماضی آہنگید خواہد بود نہ آہنگ؟ سوال کا جواب نہیں اور خرافات ہزار در ہزار" ص ۱۰+

غالب کا یہ کہنا کہ آغا نے خارج از بحث باتیں بہت لکھی ہیں اور اصل اعتراض کا جواب نہیں دیا حقیقت سے بہت دور ہی غالب نے قاطع میں صراحتہً لکھا تھا کہ آہنگ کے جو معانی برہان میں دیے ہیں ان میں سے بیشتر محتاج بہ سند ہیں، عبارت کا یہ ٹکڑا غالب نے تیغ میں نقل نہیں کیا اور یہ دیانت کے خلاف ہی آغا سند کے اشعار پیش کرنے میں بالکل حق بہ جانب تھے۔ (۱) "آہنگ کا ماضی ہونا اس کی نسبت ان کا یہ اعتراف مؤید ص ۹۴ میں

ص یہاں درفش سے اشاعت اول مراد ہی اور اسی کے صفحے کا شمار دیا ہی۔

۲۷۱۰۷

موجود ہے: "و ماضی کنہدن یعنی کشید اگر از جامع است البتہ خطا کردہ است کہ گشندہ[11] را کہ معنی ہختم جہانگیری ست،
کشیدہ بہ یای تحتانی خواندہ۔ از حق نتواں گذشت کہ صیغۂ امر کہ ہماں آہنگ است بہ مقتضاے مقام افادۂ معنی
مصدری و اسم فاعل و اسم مفعول دہد نہ معنی ماضی" غالب غلط گوئی سے آغا کو مغلوب کرنا چاہتے ہیں۔

(۸) اس کتاب میں اسی نوع کا ایک[12] اعتراض ہے:

ہفت بالفتح ایک لفظ ہے ثنائی اس میں سے ایک سو کئی لغت پیدا کئے ہیں مزا یہ ہے کہ برہان قاطع میں
بھی لکھے اور سواد ملحقات میں بھی رقم فرمائے۔ مولوی صفحہ ۲۰۴ میں اس لفظ کے باب میں ایک صفحہ پورا سیاہ کرتے ہیں
میرا اعتراض یہ ہے: "یک صد و چند لغت از ہفت، مرکب ساخت سراسر کنایہ از ہفت سپہر و ہفت سیارہ و ہفت
کشور و ہفت پردۂ چشم۔ مولوی جی نظائر ذخیرہ کا حوالہ دے کر ہفت کشور وغیرہ کی صحت میں غلو کرتے ہیں۔ کوئی پوچھے
کہ غالب نے ان الفاظ کو غلط کب کہا ہے جو تم اس کی صحت کے گواہ گزرانتے ہو۔ ایک لفظ سے سو لغت بنانے کا عذر
کہاں؟ بس خاتمہ عبارت میں لکھ دیا کہ عبارت دانائے بہتر یہی معقول است و قول معترض نا معقول
اس عذر نہ کرنے کو میں نے معاف کیا دوبارہ ملحقات میں انھیں سو لغت کے لکھنے کا تو مولوی جی جواب دیں"

غالب نے قاطع میں ہفت کی نسبت صرف یہ لکھا ہے:

"و باقی یک صد و چند لغت ہمہ از ہفت کہ عددے است معروف مرکب ساخت و از صریر قلم
در مضمار بیاں شور رستخیز انداخت، سراسر کنایہ از ہفت سپہر و ہفت سیارہ و ہفت پردۂ چشم و مہر۔ کشور کمتر
معقول و بیشتر نا معقول گوئی این رسالہ مشورۂ بود ناز پرورد کہ این دکنی آں را بہ خشم داشت فرمای رہت
نظر بازاں بدیں گونہ ہر ہفت کردہ در نظر ہا جلوہ داد و بر دیدہ و دل مجمر داں طریقت منت نہاد۔ دانم
کہ ہنگام فراز آوردن این الفاظ برفراوانی دستگاہ خویش نازمی کردہ باشد و دکنیاں دگری گفتہ باشند
مصرع: این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند"

---

[11] فرہنگ میں آہنگ کے معنی ہختم یہ ہیں: "ہختم بمعنی کشیدہ بود و آہنگیدن بمعنی کشیدن بود" معلوم ہوتا ہے کہ قلمی نسخے میں "کشیدہ" کی جگہ "کشندہ"
[12] "ہفت" نہیں "ہفت" کا ہے اور "ثنائی" نہیں "ثلاثی" کا مقام ہے۔ یہ کاتب نہیں غالب کا سہو قلم ہے۔

تیغ تیز کی عبارت سے مترشح ہوتا ہے کہ ان لغات کے برہان اور ملحقات دونوں میں موجود ہونے پر اعتراض قاطع ہی میں ہوا تھا اور آغا نے اس کا جواب مؤید میں نہ دیا یہ واقعے کے خلاف ہے یہ اعتراض پہلی بار درفش ۱۲۶ میں ہوا اور اس کا اعادہ تیغ میں کیا گیا۔ مؤید میں مراحتاً اس کا سال تصنیف ۱۲۸۰ھ درج ہے ۱۴۴ وغیرہ درفش کا سال انطباع ۱۲۸۲ھ ہے ۱۵۳ آغا مؤید میں درفش کے اعتراض کا جواب کس طرح دے سکتے تھے؟

غالب کا یہ قول کہ آغا نے اس لغا کے باب میں پورا ایک صفحہ (۲۰۴) سیاہ کیا ہے۔ بالکل غلط ہے اس صفحے پر صرف دو سطریں اس سے متعلق ہیں۔ غالب کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ مولوی جی .. نظائر وغیرہ کا حوالہ دیکر ہفت کشور وغیرہ کی صحت میں غلو کرتے ہیں" اور اس کی صحت کے گواہ گزرانتے ہیں مؤید میں اس کے باب میں صرف یہ عبارت ہے " ویک صد و چند لغت کہ دانائے تبریز بہ ترکیب ہفت آورد ه دو کس بیاں را ہر ہفت کردہ ہمہ معقول است وقول معترض نامقبول"

یہ لکھنے کے بعد کہ "کمتر معقول و بیشتر نامعقول" یہ کہنا کہ "غالب نے ان الفاظ کو غلط کب کہا ہے" غالب کا حصہ ہے۔ کل نہیں تو "بیشتر" الفاظ کو انھوں نے "نامعقول" ضرور کہا ہے اور یہ "غلط" سے کم نہیں۔

غالب کا یہ بیان کہ "یک صد و چند لغت" برہان اور ملحقات دونوں میں ہیں ایک فیصدی بھی صحیح نہیں جیسا کہ آغا نے شمشیر تیز تر (ص ۴۴) میں لکھا ہے ان میں سے ایک بھی ملحقات میں نہیں۔ ملحقات میں ایسی ترکیبیں جن کا جزو اول ہفت، ہو صرف دو ہیں، ہفت خم اور ہفت کہنہ اور یہ برہان میں نہیں مؤید میں آغا نے صراحتہً لکھا تھا (ص ۱۲۱) کہ ملحقات کا کوئی سروکار صاحب برہان سے نہیں۔ غالب کو چاہیے تھا کہ تیغ میں یا تو اسے تسلیم کر لیتے یا اس کا ثبوت دیتے کہ ملحقات صاحب برہان کے قلم سے ہے۔

(۹) غالب تیغ میں (ص ۱۰) دیدۂ عیب ساز پر اس طرح اعتراض کرتے ہیں کہ گویا یہ الفاظ آغا کے ہیں حالاں کہ وہ عبارت جس میں یہ الفاظ آئے ہیں مؤید میں صراحتہً (ص ۲-۱۹۱) مرقوم ہے کہ برہان سے منقول ہیں

(۱۰) درفش کاویانی کے دیباچۂ جدید میں قاطع پر جو اعتراض ہوئے تھے ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "حاشا کہ در ہیچ محل از عقیدۂ خویش رجوع کردہ باشم" (ص

حالانکہ دو لفظوں کے متعلق نامۂ غالب میں خود انھوں نے اقرار کیا ہے کہ مجھ سے سہو ہوا ہے اور خود

درفش سے بھی اس کا پتا چلتا ہے ص۲۵ و ص۹۴
"آویزہ اور افسوس کے بیان میں مجھ سے وہ سہو ہوا ہے کہ مجھے اس کا اقرار اور میرا دوست میاں داد خاں سیاح
شرمسار ہے" (عود ص۱۹۸)

(۱۱) غالب غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں:

"ہاں بھائی میں از روئے مصلحت اپنے کو مقامات مختلف کا عازم کہہ آیا ہوں اب جو شخص تم سے
پوچھا کرے صاف کہہ دینا کہ رام پور گیا ہے" (اردو ص۱۶۴)

غالب کو خود اعتراف ہے کہ مصلحت ہو تو غلط گوئی جائز ہے۔

(۱۲) غالب ۲۸ نومبر ۱۸۶۵ء کے خط میں رام پور سے تفتہ کو لکھتے ہیں:

"میں نثر کی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا، بھیک مانگنے آیا ہوں، روٹی اپنی گرہ سے نہیں کھاتا
سرکار سے ملتی ہے۔ وقت رخصت میری قسمت اور منعم کی ہمت" (اردو ص۸۵)

غالب نے صراحتہً یہ نہیں کہا کہ اس وقت تک کچھ نقد نہیں ملا، لیکن کنایتہً وہ اس سے انکار کرتے ہیں باوجود
اس کے کہ اصل رقم جو ملنے والی تھی وہ ۳۰ اکتوبر ہی کو مل چکی تھی اور رخصت کے وقت ایک مختصر رقم بطور زاد راہ
ملی تھی عرشی صاحب دیباچہ مکاتیب غالب میں لکھتے ہیں:

"نواب خلد آشیاں، ۳۰ اکتوبر ۱۸۶۵ء کو ایک ہزار روپیہ عطا فرما چکے تھے تاہم ۲۶ دسمبر ۱۸۶۵ء کو دو سو روپے اور بطور زاد
راہ مرحمت فرما کر مرزا صاحب کی۔ آرزو کی تکمیل کر دی ص۱۱۶"

تفتہ سے حقیقت کا اخفا اس لیے تھا کہ کہیں انھیں کچھ دینا نہ پڑے وہ زردار آدمی نہ تھے اور اس کے
باوجود آڑے وقتوں میں غالب کے کام آئے تھے۔

(۱۳) غالب یوسف مرزا کو ۱۰ جنوری ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں دیوان کے متعلق لکھتے ہیں:

"غور کرو میرٹھ کے چھاپے خانے والے محمد عظیم نے کس عجز و الحاح سے دیوان لیا تھا اور میں نے نظر
تمھاری ناخوشی پر بہ جبر اس سے پھیر لیا" اردو ص۲۹۴

سیاح کو ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں اسی کی نسبت یوں تحریر کرتے ہیں:

"دیوان کا چھاپا گیا، وہ شخص ناآشنا موسوم بہ عظیم الدین... آدمی نہیں بھوت ہے پلید ہے غول ہے، قصہ مختصر سخت نامعقول ہے مجھ کو اس کے طور پر انطباع دیوان نامطبوع ہے۔ اب میں اس سے دیوان مانگتا ہوں اور وہ نہیں دیتا" اردو ص۱۲

اس سے معلوم ہوتا ہے دیوان واپس لینے کا کچھ اور سبب تھا شیو ز ' کی دلجوئی مقصود نہ تھی۔

(۱۴) ۱۰ر جنوری ۱۸۶۲ء والے خط میں یہ عبارت بھی ہے؛

"رام پور سے وہ دیوان صرف تمھارے واسطے لکھوا کر لایا... تمھارا مال ہے۔"

اس خط میں یہ لکھا کہ دیوان رام پور سے صرف شیو نرائن کے سلے لائے تھے اور ۱۸۶۱ء میں شیو نرائن کو اصل حقیقت بتا چکے تھے کہ دیوان ضیاء الدین احمد کے لیے لکھوایا اور انھیں رام پور سے دہلی بھیجا گیا تھا۔

"اب جو میں دلی سے رام پور جانے لگا تو بھائی ضیاء الدین خاں صاحب نے مجھ کو تاکید کر دی تھی کہ تم نواب صاحب کی سرکار سے دیوان اردو لے کر کسی کاتب سے لکھوا کر مجھ کو بھیج دینا میں نے کاتب سے لکھوا کر ضیاء الدین خاں کو دلی بھیج دیا تھا.. اب جو منشی ممتاز علی صاحب نے مجھ سے کہا تو مجھ سے یہی کہتے بن آئی کہ اچھا دیوان تو میں ضیاء الدین خاں سے لے کر بھیج دوں گا مگر کاپی کی تصحیح کون کرتا ہے؟ نواب مصطفیٰ خاں نے کہا کہ میں اب کہو میں کیا کرتا۔ دلی آکر دیوان بھیج دیا اگر میں اپنی خواہش سے چھپواتا تو اپنے گھر کا مطبع چھوڑ کر برائے چھاپے خانے میں کتاب کیوں بھجواتا؟" اردو ص۳۲

(۱۵) غالب کا ایک قصیدہ نصیرالدین حیدر شاہ اودھ کی مدح میں ہے جس میں ضمناً روشن الدولہ وزیر اودھ کی بھی تعریف کی ہے اس کا مطلع یہ ہے؛

گر بہ بستن کدہ روضۂ رضواں نرستم ہوس زلف تراسلسلہ جنباں رستم نظم ص۲۸

اس قصیدہ کی نسبت تفتہ کو اگست ۱۸۶۱ء کے خط میں لکھتے ہیں؛

"بڑا پرانا قصہ تم نے یاد دلا دیا، داغ کہنہ حسرت کو چمکا دیا۔ یہ قصیدہ منشی محمد حسن کی معرفت روشن الدولہ کے پاس گیا روشن الدولہ کے توسط سے نصیر الدین حیدر کے پاس گزرا اور جس دن گزرا

اسی دن پانچ ہزار روپیہ بھیجنے کا حکم ہوا۔ متوسل یعنی منشی محمد حسن نے مجھ کو اطلاع نہ دی منظفرالدولہ[۱۸]
مرحوم لکھنؤ سے آئے انھوں نے یہ راز مجھ پر ظاہر کیا اور کہا خدا کے واسطے میرا نام منشی محمد حسن کو نہ لکھنا۔ ناچار
میں نے شیخ امام بخش ناسخ کو لکھا کہ تم دریافت کرکے لکھو کہ میرے قصیدے پر کیا گزری انھوں نے جواب لکھا
کہ پانچ ہزار ملے تھے روشن الدولہ نے کھائے دو ہزار منشی محمد حسن کو دیے اور فرمایا کہ اس میں سے جو مناسب
جانو غالب کو بھیج دو۔ کیا اس نے ہنوز تم کو کچھ نہ بھیجا؟ اگر نہ بھیجا ہو تو مجھ کو لکھو۔ میں نے لکھ کر بھیجا کہ مجھے
پانچ روپے بھی نہیں پہنچے اس کے جواب میں انھوں نے لکھا کہ اب تم مجھے خط لکھو اس کا مضمون یہ ہو کہ میں
نے بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ بھیجا ہے اور یہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ قصیدہ حضور میں گزرا مگر یہ میں نے نہیں جانا کہ
اس کا صلہ کیا مرحمت ہوا۔ میں کہ ناسخ ہوں اپنے نام کا خط بادشاہ کو پڑھوا کر ان کا کھایا ہوا روپیہ ان کے حلق
سے نکال کر تم کو بھیج دوں گا۔ بھائی یہ خط لکھ کر میں نے ڈاک میں روانہ کیا، آج خط روانہ ہوا، تیسرے دن شہر
میں خبر اڑی کہ نصیرالدین حیدر مر گیا اب کہو میں کیا کروں اور ناسخ کیا کرے (اردوئے معلیٰ ص ۲۴۰)

یہ قصیدہ علاوہ اور نسخوں کے کلیات کے دو ایسے نسخوں میں بھی موجود ہے جو غالب کی [نظر سے] گزر چکے ہیں ایک
کی کتابت ربیع الآخر ۱۲۵۰ھ میں اور دوسرے کی ذیقعدہ ۱۲۵۱ھ میں تمام ہوئی ہے اور یہ دونوں نسخے
کتب خانہ مشرقیہ بانکی پور کی ملک ہیں اس قصیدے کا عنوان ان دونوں میں یہ ہے:

”گزارش خیال بہ لکھنؤ بہ سروبرگ ذریعۂ این قصیدہ و نگارش نثرے برنقش مدح شاہ اودھ در جریدہ [illegible]
یادگار ماندن مدح بہ ممدوح نارسیدہ از عالم مستی بہ بوے بادۂ ناکشیدہ“

---

۱۸ غالب کا ایک فارسی خط نوروز علی خاں بہادر کے نام غالباً اسی زمانے کا ہے اس میں منظفرالدولہ کے لکھنؤ سے آنے کا ذکر
اس خط میں منشی محمد حسن کا نام بھی آیا ہے غالب اور ان کے تعلقات بدستور رہیں اگر منظفرالدولہ نے لکھنؤ سے آکر ان کی خیانت کا حال
بیان کیا ہوتا تو تعلقات میں فرق ضرور آتا۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ منشی محمد حسن اور منشی محمد حسن خاں دو مختلف شخص ہیں یا یہ کہ منظفرالدولہ لکھنؤ
گئے جاتے رہتے تھے یہ واپسی اس واپسی سے مختلف ہے جس کا ذکر نسخہ کے خط میں ہے (خط کے لیے نثر ص ۱۲۳) +

۱۹ کیا ناسخ کو عزل معتمدالدولہ کے بعد اتنا رسوخ حاصل تھا کہ روشن الدولہ کی علانیہ مخالفت کی جرأت کر سکتے؟

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ قصیدہ ممدوح تک نہ پہنچا۔ صلے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

متفرقات غالب میں جو ابھی حال میں شائع ہوا ہے غالب کا ایک خط ناسخ کے نام ہے اس کا مرجع قصیدۂ مذکورہ بالا سے تعلق ہے۔ اس کے ضروری عبارات ملاحظہ ہوں:

"مشکیں رقم صحیفۂ مشام آرزو را غالیہ سا ... آمد خامۂ ممدوح بہ گلبانگ التفات پردۂ چند از پرسش رو دادِ سخن را در رہ دو مقام نشست ہمدمی بخشید۔ نخست در معرض استفسار کمیت زر ڈگری و آں گاہ برہنمونی سفر دکن نہفتہ مباد آنچہ در عبودیت نامۂ پیش از ایں عالم گفتہ شدہ بود سراپا بیان داشت ورنہ مرا کہ باکشاکش تقاضا خو کردہ ... ام از ایں ہنگامہ بر دل بندے دگر نہ دے ست و خود ایں مایہ زر کہ از من بدار القضا خواستہ می شود بداں نمی ارزد کہ خاطرم را پراگندگی دہد۔ آنچہ گرامی بایدداد از چہل ہزار افزوں تر و از پنجاہ ہزار کمتر است۔ حاشا کہ بدیں وجہ آرزوے امرا گرد دل گردد یا خود ما سبحان ... دہ باشد مگر ایں قدر از دست بہم دہد تا بہ نشینم و مشت مشت بر ہمہ عیاں فشانم و خود را از ایں خاکدان تنگ نامند برکران کشیدہ قلندر گردم ... ایں کہ لختے از عمر تلف نمودم و مدح شاہ اودھ سرودم آرایش لباس ایں تمنا بود .. چوں کار ساختہ نہ شد و زمزمۂ من بدل ہاے سخت شاہی فردو نیامد روے گرداندم و سر خود در یغ خوردم۔ اکنوں من کجا و سفر دکن کجا!" ، صفحہ ۱۰۲

غالب نے یہ خط ظاہر ہے کہ نصیر الدین حیدر کی موت سے پہلے لکھا ہے اس میں بادشاہ کے صلہ دینے اور روشن الدولہ اور منشی محمد حسن کی خیانت کی طرف اشارہ بھی نہیں یہ حکایت کہ انعام لیکن غالب تک نہ پہنچ سکا اختراعی ہے۔

۱۶) ۱۲۷۶ھ میں جب قاطع تمام ہوئی ہے تو دنیا کو پہلی بار اس کا علم ہوا کہ غالب کا ایک استاد عبدالصمد بھی تھا۔[۱۶] اس سے بہت پہلے جب ان کی عمر ۴۴ برس کی تھی وہ ایک فارسی میں نثر میں لکھ چکے تھے کہ:

"در سخن از پرورش یا فتگان مبدء فیاضم و سواد معنی را بہ فروغ گوہر خویش روشن کردہ ام از ہیچ آفریدہ منت آموزش بہ گردنم و بار منت رہنمائیم بر دوش نیست۔"

حالی اس اعتراف کے باوجود کہ "کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سنا گیا ہے کہ مجھ کو مبدء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے اور عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے چونکہ مجھ کو لوگ بے استاد کہتے تھے ان کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی استاد گڑھ لیا ہے" اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ "عبدالصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا اور مرزا نے اس سے کم و بیش فارسی زبان سیکھی تھی (یادگار صفحہ ۱۴) عبدالصمد اگر فرضی نام ہے تو جھوٹ ظاہر ہے اگر واقعی اس نام کے کسی شخص سے فارسی سیکھی تھی تو انکار راست گفتار آدمی کا کام نہیں

(۷) غالب کا یہ بیان کہ نواب یوسف علی خاں نے دو سو روپے قاطع کے چھپوانے کے لیے دئے تھے (اردو صفحہ ۱۴۲) میری رائے میں حقیقت کے خلاف ہے یہ اس واسطے نہیں کہ رام پور سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی (دیباچہ مکاتیب صفحہ ۱۲۹) نہ اس لیے کہ قاطع کی تقریظ میں غالب کا لفظاً ذکر نہیں، غالب نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ میں اسے خلاف واقعہ تقریظ کی اس عبارت کی بنا پر سمجھتا ہوں جو نواب کلب علی خاں سے متعلق ہے۔ ریاست کے معاملات بہت نازک ہوتے ہیں غالب روپے پاکر یہ ہرگز نہیں لکھ سکتے تھے کہ "اگر ایں جواں مرد... بہ بستن شیرازہ اوراق پریشان پرداختے کاغذ مسودات قاطع برہان را... سر بسر فروش خریدے تا چکہ ہا ساختے"

(۸) غالب کے اسی بیان میں جس کا ابھی ذکر ہوا یہ بھی ہے کہ درفش کے چھاپنے کے لیے یوسف علی خاں نے دو سو دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن ایفا سے قبل ہی مر گئے وعدے کی از روئے دفتر تصدیق نہیں ہو سکتی اس لیے اس کا امکان کہ ان کے جانشین سے یہ روپے وصول ہوں کم ہے غالب کو یہ علم کیونکر ہوا کہ نواب نے دفتر کو اس کی اطلاع دی تھی اور وہاں اس کے متعلق کوئی تحریر موجود نہیں؟ یہ بھی بنائی ہوئی بات ہے

غالب کے یہاں بالارادہ حقیقت سے انحراف کی اور بھی مثالیں ملتی ہیں لیکن اس مقالہ کا خاتمہ غالب کے ایک بیان پر کیا جاتا ہے جس میں دروغ گوئی کا اعتراف تو موجود ہے لیکن یہ دروغ گوئی ایک دوست کی بھلائی کے لیے ہے حسین مرزا سے کہتے ہیں:

"ابھی... تمہارا قرض خواہ آیا تھا کچھ سچ کچھ جھوٹ کہہ کر اس کو راہ پر لایا ہوں کہ سو دو سو روپے تم کو بھیج دے" (اردو صفحہ ۱۴۱)

(۱۵ فروری ۱۹۵۳ء)

یوسف حسین خاں

اُردو غزل میں رمزیت

شعر کی تاثیر کا انحصار لفظوں کے حسن اور موزوں استعمال پر ہوتا ہے لیکن شعر کی روح چونکہ رمز و ایہام میں پوشیدہ ہے اس لیے لفظوں کے معنی میں تشبیہ اور استعارہ اور کنایہ سے وسعت پیدا کی جاتی ہے تشبیہ میں وہ قوت اور تاثیر نہیں ہے جو استعارہ اور کنایہ میں پائی جاتی ہے اس لیے کہ اس میں رمز و ایہام کا ایمائی عنصر نسبتاً کم ہوتا ہے اور اس کے استعمال سے ایک حد تک مطالب میں وضاحت آ جاتی ہے اگر استعارہ اور کنایہ بالاستعارہ کا استعمال اس لیے کیا جائے کہ معنی واضح ہوں تو وہ بھی تشبیہ کے مثل ہو جائیں گے اور ان کی قوت و تاثیر میں کمی آ جانی لازمی ہے استعارہ سے حقیقت کی تصویر کشی مقصود نہیں ہوتی بلکہ اس کی پیچیدگی اور الجھاؤ کو ظاہر کرنا۔ عالم فطرت کی وسعت، کثرت، تنوع اس کی بلندیاں اور پستیاں زمان و مکان کی کہیں نہ ختم ہونے والی پہنائیاں ذہن کی شعوری اور غیر شعوری کیفیات دقیق اور الجھی ہوئی ہوتی ہیں جن کی طرف شاعر متوجہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ان سب سے زیادہ الجھی ہوئی حقیقت خود اس کے دل کی دنیا اور اس کے جذباتی حقائق ہیں جنھیں حرف و صوت کی شکل میں وہ ظاہر کرنا چاہتا ہے استعارہ دوہرا مطلب رکھتا ہے ایک کی جگہ دو تصورات ذہن کے سامنے آتے ہیں لیکن دونوں میں وحدت پوشیدہ ہوتی ہے استعارہ اور کنایہ کی مدد سے جذباتی حقائق کی بوقلمونی ایک لمحہ میں دل نشین ہو جاتی ہے جس کی وضاحت اگر منطقی طرز میں کی جائے تو صفحے کے صفحے سیاہ ہو جائیں لیکن اصل بات کا پتہ نہ چلے۔ استعارہ ایک طرح کا پس منظر مہیا کرتا ہے جس پر شاعر کی بصیرت حرکت کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ غزل میں استعارہ کو اہمیت حاصل ہے اور نظم میں تشبیہ کو اس لیے کہ ثانی الذکر کا مقصد تفصیل اور تشریح سے مضمون کو سامع کے دل نشین کرنا اور اول الذکر رمز و ایما کے ذریعہ تحیر میں اضافہ کرنا۔ استعارہ معنی آفرینی اور جدت ادا کا ایک زبردست وسیلہ ہے جسے تغزل میں برتنا شاعرانہ کمال پر دلالت کرتا ہے اس کے ذریعہ معمولی سی بات کو کہاں سے کہاں پہنچایا جا سکتا ہے مثلاً غالب اس مضمون کو استعارہ کی زبان میں کیا خوب بیان کرتا ہے

کہ انسان کی عمر گذری چلی جاتی ہے اور اس پر اس کو کوئی قابو نہیں یہ شعر رمزی محاکات کا کمال ظاہر کرتا ہے جس میں داخلی اور خارجی عناصر ہم آغوش ہیں۔

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

استعارہ نے معنی کو چار چاند لگا دئے اور معنی کی بلندی اور خوبی نے لفظوں کے چناؤ میں شاعر کو مدد دی۔ یہی حسن ادا ہے جس کی مثالوں سے غالب کا کلام بھرا پڑا ہے انسانی ہستی بے ثبات کی تصویر استعارہ اور تمثیل میں دوسری جگہ یوں پیش کی ہے

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

غزل گو شاعر اپنے اندرونی جذبات کو تخئیل کی زباں میں بیان کرنے کے لیے کبھی معانی کے لیے موزوں الفاظ تلاش کرتا ہے اور کبھی الفاظ کے لیے معنی ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے معانی سے لفظوں کی خارجی صورت متعین ہوتی ہے اور لفظوں کے برمحل استعمال سے خود معانی کا تعین عمل میں آتا ہے شاعر کا خیال زبان اور معانی دونوں میں قدر مشترکہ ہوتا ہے اور دونوں میں رشتہ اور ربط قائم کرتا ہے۔ الفاظ اور معانی کے صحیح ربط سے حسن ادا کی جلوہ گری ہوتی ہے جس کے بغیر کلام میں تاثیر نہیں آسکتی علم و نظر کی وسعت سے معنی آفرینی کے میدان میں وسعت پیدا ہوتی ہے کبھی بعض مخصوص شعری علامات یا تلمیحات کا آسرا لیا جاتا ہے لیکن صنائع و بدائع سے شعر کے الفاظ کی نشست و ترتیب میں حسن پیدا کیا جاتا ہے یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ غزل میں حسن ادا کہاں سے آتا ہے اس کے قواعد وضوابط مقرر کرنا ممکن نہیں ایک مطلب کو ایک شاعر اس طرح ادا کرتا ہے کہ لطف آجاتا ہے اور دوسرا وہی بات کہتا ہے اور سننے والے ذرا بھی متاثر نہیں ہوتے یہ امتیاز ذوقی چیز ہے عشق کے پامال مضمون پر غالب کا ایک شعر ہے اور ذوق کا ایک شعر، دونوں شعروں کے فرق سے دونوں کی شخصیت کا فرق واضح ہو جاتا ہے غالب کہتا ہے

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد لادوا پایا

ذوق اپنے علم و نظر کے مطابق عشق کو تیرہ خاکدان کے لیے چراغ قرار دیتے ہیں معانی اچھے ہیں لیکن لفظوں کی نشست سے اس مضمون کی بلندی کی طرف ذہن راغب نہیں ہوتا بلکہ معمولی اور ہلکی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ جذبات کے لیے طرز و اسلوب کی بلندی لازمی ہے ورنہ کلام بے اثر رہے گا۔ ان کا شعر ہے

فروغِ عشق سے ہے روشنی جہاں کے لیے یہی چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کے لیے

اس غزل میں محض رعایت لفظی سے جو معنیٰ آفرینی کی کوشش کی ہے وہ کس قدر بھدّی ہے کہتے ہیں

الٰہی کان میں کیا اس صنم نے پھونک دیا کہ ہاتھ رکھتے ہیں کانوں پہ سب اذاں کیلئے

ذوق کے ہاں اس رعایت لفظی کی کثرت سے طرز ادا کی کوئی ندرت یا حسن پیدا نہ ہو سکا محمد حسین آزاد انھیں چاہے کچھ سمجھتے رہے ہوں لیکن تغزل میں اُن کا کوئی مرتبہ بلند نہیں اور غالب کی تو وہ گرد کو بھی نہیں پہنچتے۔

طرز ادا کا انحصار الفاظ اور معنی دونوں پر ہے جو کلام کے اجزائے لاینفک ہیں اگرچہ معانی شعر کی جان ہوتے ہیں لیکن انھیں الفاظ کی جو خارجی قبا زیب تن کرائی جاتی ہے وہ بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے شعر کے اور خاص طور پر شعر غزل کی خارجی ہئیت و اثر کا مدار الفاظ کے صحیح اور موزوں استعمال پر ہوتا ہے الفاظ کو شعر کا جسم اور معانی کو روح سمجھا جائے تو ضرور ہے کہ جس ولطیف روح کا خارجی قالب بھی کشش اور لطافت رکھتا ہو۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روح اور جسم ایک دوسرے کو نہایت ہی پراسرار طور پر متاثر کرتے ہیں انسانی روح کے احوال بڑی حد تک مادی جسم میں کسی نہ کسی صورت میں ضرور ظاہر ہو جاتے ہیں اس طرح مادی جسمانی کیفیات روح پر اپنا گہرا چھاپ لگائے بغیر نہیں رہتیں۔ بالکل یہی حال الفاظ اور معانی کا ہے۔ اگر کوئی لفظ موقع محل اور مقتضائے حال کے مناسب ہو تو اس کی تاثیر اس لفظ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہوگی جو یونہی بدسلیقگی اور بے تکے پن سے استعمال کر دیا گیا ہو چاہے آپ کے معانی کتنے ہی بلند اور گہرے کیوں نہ ہوں اگر اُن کی خارجی صورت غیر جاذب نظر اور دل نشینی سے معرا ہے تو خود معانی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اور تاثیر تو نام کو بھی نہیں پیدا ہو سکتی۔ شعر غزل کی رمزی اور ایمائی کیفیت اس وقت پاتی ہے جب الفاظ و معانی ہم آہنگ اور مقتضائے حال کے سب مطالبوں کو پورا کرتے ہوں اس سے طرز ادا کی دلنشینی عبارت ہے

الفاظ میں تصورات پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ہر تصور اپنا ایک پس منظر رکھتا ہے جو ہمیں ذہنی طور پر مخصوص گرد و پیش میں لے جاتا ہے غزل گو شاعر بعض دفعہ تلمیحات کے ذریعہ جو دراصل ایمائی حیثیت رکھتی ہیں ہمیں ایک خاص فضا کی سیر کرا دیتا ہے۔ موسیٰ اور طور، شیریں و فرہاد، لیلیٰ اور مجنوں، محمود و ایاز کی تلمیحیں تلازم خیالات

کی بازآفرینی کے لیے زبردست محرکات شعری بن جاتی ہیں اور یہ صرف تلمیحات ہی تک محدود نہیں۔ ہر لفظ میں قوت اور توانائی کا خزانہ مخفی ہوتا ہے بشرطیکہ اس کا برتنے والا اس کے استعمال کا ڈھب جانتا ہو بقول غالب

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے — جو لفظ کہ غالب میرے اشعار میں آئے

ہر لفظ کی ایک جوہری انفرادیت ہوتی ہے چنانچہ کسی ایک لفظ سے جو خیالی تلازمات اور ذہنی متعلقات پیدا ہوتے ہیں وہ اس کے مرادف الفاظ سے کبھی بھی پیدا نہیں ہوسکتے وجہ ہے کہ دنیا کی کسی ایک زبان کے شعر کا دوسری زبان میں جیسا ترجمہ ہونا چاہیے ویسا نہیں ہوسکتا۔ بعض دفعہ ایک لفظ میں ایک جہان معنی پنہاں ہوتا ہے اور ذہن کو ایک خاص فضا میں لے جاتا ہے چنانچہ شعر غزل میں آہنگ احساس اور آہنگ سماعی کا جو ایک لطیف ربط قائم ہو جاتا ہے اس کو کسی دوسری زبان میں منتقل نہیں کیا جاسکتا بحر اور قافیہ اور ردیف کے سانچوں میں ڈھل کر لفظوں کی جوہری انفرادیت اور تاثیر میں اضافہ ہو جاتا ہے اور انھیں سن کر تحت الشعور کی بھولی بسری یادیں تازہ ہو جاتی ہیں بالکل اسی طرح جیسے بعض وقت خواب کی حالت میں گزشتہ واقعات اپنی جیتی جاگتی شکل میں نظر کے سامنے آجاتے ہیں یہ خواب کی کیفیت بھی دراصل اشارہ اور کنایہ کی کیفیت ہوتی ہے جن کی تفصیلی خلا کو حافظہ بعد میں پر کر لیتا ہے

غزل کی ہر بحر اپنے اندر ایک قسم کا رمز اور ایما رکھتی ہے مثلاً بحر رمل جو سرعت کے ساتھ پڑھی جاتی ہے اردو غزل نگاروں کے ہاں اپنی سماعی خوبیوں کی وجہ سے بہت مقبول ہوئی ہے۔ یہ بات دعویٰ سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن میرا خیال ضرور ہے کہ عربی اور فارسی میں اس بحر کو اتنی مقبولیت حاصل نہ ہوئی جتنی کہ اردو میں۔ ممکن ہے کہ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ یہ بحر ہندی بحروں سے نسبتاً قریب ہے اس بحر کے اشعار کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

رمل مسدس مجنون مقصور

شیشۂ مے کی طرح اے ساقی — پھر تو مت کہ بھرے بیٹھے ہیں (مصحفی)

ناصحو آپ میں جرأت نہ رہی — اب سمجھ کر اسے سمجھائیے گا (جرأت)

رمل مثمن مخبون محذوف

ہوس گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا | عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے | غالب
چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں | کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں | صہبا لکھنوی
ترے وعدہ پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا | کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا | غالب

رمل مسدس مخبون محذوف

کچھ آشفتہ سری نے مارا | کہ مجھے چارہ گری نے مارا | مومن
اہل تدبیر کی واماندگیاں | آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں | غالب
ہجر کے غم سے نہ گھبرا جرأت | اتنا حیران نہیں رہنے کا | جرأت
یوں تو رد بیٹھے ہیں گر لوگوں سے | پوچھتے حال ہیں اکثر میرا | نظام رامپوری
تھک کے بیٹھوں تو یہ کہتا ہے جنوں | دو قدم کوچۂ رسوائی ہے | جلیل

بحر اور ردیف قافیہ کے موزوں انتخاب کے علاوہ غزل گو شاعر خاص طور پر ایسے الفاظ برتتا ہے جس کے ساتھ شعری تصورات صدیوں سے وابستہ ہو گئے ہیں اور ان سے ایک خاص قسم کی ایمائی فضا کی تخلیق ممکن ہے۔ طرز ادا اور حسن ادا اس سے کوئی علیحدہ چیز نہیں۔ میں اس جگہ صرف چند اس قسم کے علامتی لفظوں کی مثالیں پیش کرتا ہوں مثلاً جنون، گریبان، زنجیر، موج، نقاب آشیان قفس اور اسی طرح کے بہت سے دوسرے الفاظ ہیں گریبان کے چاک ہونے میں خاص رمزی اور ایمائی کیفیات پنہاں ہیں جنھیں ہمارے شعراء نے محسوس کیا ہے مثالیں ملاحظہ ہوں

جنون و گریبان

رنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی | اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا | میر
اب کے جنوں میں فاصلہ شاید ہی کچھ رہے | دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں | میر
دست جنوں کے جائیے صدقے کہ چین سے | پھیلائے پاؤں ہم نے گریباں کے چاک میں | مومن
تب چاک گریباں کا مزہ ہے دل ناداں | جب اک نفس الجھا ہوا ہر تار میں آوے | غالب

بے کاری جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل | جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی | غالب
نہ لڑ ناصح سے ناداں کیا ہوا گر اس نے شدت کی | ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر | غالب
گر یہی بہار کی شورش تو ناصحا | مجھ سے ہو سکے گی گریباں کی احتیاط | جعفر علی حسرت
جوش جنوں سے کچھ نہ چلی ضبط عشق کی | سو جگہ سے آج گریباں نکل گیا | جگر
نشانی ہم نے رکھ چھوڑی ہے اک گلی بہار اگلی | بہار آئی گلے میں ڈال لی دھجی گریباں کی | بیخود دہلوی
کچھ موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی | شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی | میر
قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد | ہاں کچھ اک رنج گراں باری زنجیر بھی تھا | غالب
خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں | ہیں گرفتار وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا | "
رخصت اے زنداں جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے | مژدہ خار دشت پھر تلوہ مرا کھجلائے ہے | ذوق

موج کی حرکت اور بے تابی تغزل کی رمزنگاری میں مختلف پیرایوں میں ملتی ہے کہیں موج رنگ کہیں موج گل کہیں موج شراب اور کہیں خالی موج محرک شعری بنی ہے غالب کے یہاں خاص کر اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ گل میں موج رنگ کی شوخی فریفتہ ہونے کی چیز نہیں رنگ تو اصل میں گل کی خونیں نوائی کا نتیجہ ہے حسن توجیہہ ملاحظہ ہو

جو تھا سو موج رنگ کے دھوکے میں مر گیا | اے وائے نالۂ لب خونیں نوائے گل | غالب

ایک پوری موج شراب والی غزل اسی رنگ میں ہے اور برسات کے موسم کی مناسبت سے موج کی رمزی اور ایمائی کیفیت میں خاص لطف پیدا ہو گیا ہے۔

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موج شراب | دے بط مے کو دل و دست شنا موج شراب
ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر | موج ہستی کو کرے فیض ہوا موج شراب
چار موج اٹھتی ہے طوفان طرب سے ہر سو | موج گل موج شفق موج صبا موج شراب
موجۂ گل سے چراغاں ہے گذرگاہ خیال | ہے تصور میں زبس جلوہ نما موج شراب
ایک عالم پہ ہیں طوفانی کیفیت فصل | موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موج شراب

ہوش اُڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسدؔ　　پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

غالب نے محبوب کی رفتار کی شگوفہ طرازی کے ذکر میں موج کے دل نشین استعارہ سے کیا خوب کام لیا ہے۔

دیکھو تو دل فریبیٔ اندازِ نقشِ پا　　موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

جب کہ نقشِ مدعا ہووے نہ جز موجِ سراب　　وادیٔ حسرت میں پھر آشفتہ جولانی عبث

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے　　کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

دل و جگر میں پر افشاں جو ایک موجۂ خوں ہے　　ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے

جگرؔ کے یہاں ایک موج مے خانہ کو بہالے جاتی ہے۔ کہتے ہیں

میکشو! مژدہ کہ باقی نہ رہی قیدِ مکاں　　آج ایک موج بہالے گئی مے خانہ کو

جگرؔ کے یہاں لفظ موج کی ایمائی جھلکیاں جا بجا دکھائی دیتی ہیں

پی بھی جا زاہد خدا کا نام لے کر پی بھی جا　　بادۂ کوثر کی بھی اک موج پیمانہ میں ہے

ترے جلووں کو دیکھیں اور مرے دل کی طرف دیکھیں　　کہاں ہیں اتصالِ موج و ساحل دیکھنے والے

ساقی کی فیضِ مست نگاہی کے میں نثار　　ایک ایک موجِ مے کو رگِ جاں بنا دیا　　جگرؔ

کیا قطرہ کیا دریا، کس کا طوفاں کس کی موج　　تو جو چاہے تو ڈبو دے خشکیٔ ساحل مجھے

"موجِ ہوائے دردِ دل" کی ترکیب اور اس کی معنویت قابلِ ملاحظہ ہے

جس طرف وہ شوخ نظریں اٹھ گئیں　　لے اڑی موجِ ہوائے دردِ دل

نقاب خود رمز و ابہام کی کیفیت پیدا کرنے والی چیز ہے چنانچہ غزل کی رمز نگاری کے لیے یہ لفظ اور اس کے ساتھ جو مفہوم وابستہ ہے وہ خاص مناسبت رکھتا ہے اردو غزل گو شاعروں کے دیوان لفظ نقاب کی مضمون آفرینیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ طلب ہیں

ویسے ظاہر کا لطف ہے چھپنا　　کم تماشہ نہیں یہ پردہ کچھ　　میرؔ

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا　　مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی　　غالبؔ

نظارہ کیا حریف ہو اس برق حسن کا　　جوش بہار جلوہ کو جس کے نقاب ہے　　غالب

منھ نہ کھلنے پر وہ ہے عالم کہ دیکھا ہی نہیں　　زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منھ پر کھلا　　"

شوخی نے تیری لطف نہ رکھا حجاب میں　　جلوہ نے تیرے آگ لگا دی نقاب میں　　شیفتہ

وہ میں کہ دیکھ رہا ہوں نقاب بن کے تجھے　　وہ تو چھوڑ دیا ہے نقاب کر کے مجھے　　وقار ابوری

عشق ہی کے ہاتھوں میں کچھ سکت نہیں رہتی　　ورنہ جبر ہی کیا ہے گوشۂ نقاب ان کا　　جگر

اس سے دل کا ہر اک نقش جلوہ بے تاب ہوا　　مری نظر نہ ہوئی آپ کا حجاب ہوا　　"

قفس اور آشیانہ کی تمثیل میں اردو غزل گو شاعروں نے جدت ادا کا حق ادا کیا ہے یہ محض جدت ادا اور حسن تخیل ہے جس کی وجہ سے فرسودہ مضمون میں بھی تازگی اور شگفتگی آجاتی ہے لفظ کے معمولی معنی سے زیادہ اہمیت اس بات کو ہے کہ اس کے برتنے والے کے ذوق و وجدان میں اس کا کیا مفہوم ہے۔ قفس اور آشیانے کے علامتی الفاظ کو دیکھیے کس طرح ہمارے شاعروں نے برتا ہے

جب کوندتی ہے بجلی تب جانب گلستاں　　رکھتی ہے چھیڑ میرے خاشاک آشیاں سے　　میر

کیا کیا قفس سے سر مارا　　موسم گل میں ہم رہا نہ ہوئے　　"

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم　　گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو　　غالب

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی　　آشیاں اپنا ہوا برباد کیا　　مومن

خوشا قسمت قفس میں ہم قفس پر سیکڑوں پردے　　نظر بھی اب تو جا سکتی نہیں دیوار گلشن تک　　(نسیم دہلوی)

روداد چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں　　جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا　　اصغر

سو بار جلا ہے تو یہ سو بار بنا ہے　　ہم سوختہ جانوں کا نشیمن بھی بلا ہے　　"

گلچیں برا کیا جو یہ تنکے جلا دئے　　تھا آشیاں مگر ترے پھولوں سے دور تھا　　ثاقب لکھنوی

بجلی کے گرنے سے ماتم ایک ہی ہوتا تو خیر!　　آشیاں کے ساتھ آنچ آئی مری حسرت پہ بھی　　"

شاید میں درخور نگہ گرم بھی نہیں　　بجلی تڑپ رہی ہے مرے آشیاں سے دور　　فانی

اس کے سوا نہیں خبر آشیاں مجھے　　میں تھا اسیر دام تو بجلی چمن میں تھی　　"

فصل گل جو یاد آئی آشیاں بھی یاد آیا　　فصلِ گل میں اجڑا تھا شاید آشیاں اپنا　　فانی

ہماری شاعری میں اس طرح کے بیسیوں علامتی الفاظ ہیں جو باوجودیکہ پیش پا افتادہ اور بظاہر فرسودہ ہونے کے حسن استعمال کے باعث ایمائی اثر کا خزانہ اپنے اندر پوشیدہ رکھتے ہیں۔ دراصل کسی زبان کا کوئی لفظ بھی پرانا اور فرسودہ نہیں ہوتا نئے لفظ اور نئی بندشیں بیکار ہیں اگر ان میں ایمائی اثر آفرینی نہ ہو۔ اور اگر شاعر ایمائی اثر پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ پرانے اور رسمی لفظوں میں جان ڈال دے گا مثلاً چند رسمی لفظ یہ ہیں رہرو اور منزل، کشتی اور ساحل، شمع اور پروانہ جلوہ، تماشہ تمنا وغیرہ ان کی مثالیں دینے میں بڑی طوالت ہوگی ان سب لفظوں کو ہمارے شاعر دو سو برس سے برت رہے ہیں لیکن آج بھی ہمیں ان میں عجیب و غریب لطف ملتا ہے یہ اعجاز ہے قادر الکلامی کا۔ قادر الکلام شاعر لفظوں کو فاتحانہ انداز میں برتتا ہے وہ اگر کسی ایسے مضمون کو پیش کرنا چاہتا ہے جسے اس کا کوئی پیشرو پہلے برت چکا ہے تو باوجود اس کے وہ اپنی شخصیت کے اثر سے اس میں تازگی اور ندرت پیدا کر دے گا۔ کوئی لفظ اور کوئی مضمون محض پہلے برتے جانے کی وجہ سے فرسودہ نہیں ہو جاتا۔ اچھا شاعر اپنے نفس گرم سے مضمحل اور مردہ لفظوں میں بھی نئی روح پھونک سکتا ہے کہ غزل گو شاعر کے لیے لفظ محض علامتیں ہیں ذہن کو حقیقت کے بجائے مجاز کی طرف منتقل کرنے کی۔ تغزل کا یہی طلسم یا اعجاز ہے جو اس صنف سخن کو ہمیشہ باقی رکھے گا اور جو شاعر اس قسم کا جادو چلا سکے گا اس کو استادی کا فخر نصیب ہوگا۔ کوئی مضمون کسی شاعر کی ملکیت نہیں ہو جاتا۔ وہ اسی کا ہو جاتا ہے جو اسے اچھی طرح برت سکے۔ اس باب میں تقدم و تاخر کوئی معنی نہیں رکھتے۔ مثلاً اگر کسی شاعر نے کسی مضمون کو پہلے برتا اور دوسرے شاعر نے اسی کو کچھ عرصہ بعد باندھا اور اپنے پیشرو کے مضمون کے مقابلے میں اس کو زیادہ بلند کر دیا تو مضمون اسی کا ہو جائے گا نظیری کا مشہور شعر ہے

بوئے یار من ازیں سست وفا می آید　　گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم

سودا نے تھوڑے تصرف سے مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا　　ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

مومن خاں کا شعر ہے

نہ جاؤں گا کبھی جنت کو میں نہ جاؤں گا　　اگر نہ ہووے گا نقشہ تمہارے گھر کا سا

غالب نے اسی مضمون کو دوسری طرح سے پیش کیا ہے اور اس کو اور زیادہ بلند کر دیا

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت　　یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

سودا کا شعر ہے

ساقی ہے اک تبسم گل موسم بہار　　ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں

غالب نے اسی مضمون میں کیا طرفہ کاری دکھائی ہے

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام　　دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

غالب کا شعر ہے

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو　　اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائیگا

ذوق نے اسی مضمون کو زیادہ بلیغ انداز میں ادا کیا ہے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے　　مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

خواجہ میر درد کہتے ہیں کہ حضور یار میں انسان ہی نہیں غیر جاندار اشیا بھی رعب حسن سے متاثر ہوتی ہیں

رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور　　شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

داغ نے اسی مضمون کو اپنی شوخ بیانی سے چار چاند لگا دئے کیا خوب کہا ہے

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں　　ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

غالب نے شوق پا بوسی کے مضمون پر معاملہ بندی کا نہایت اعلیٰ درجہ کا شعر کہا ہے

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر　　ایسی باتوں سے وہ ظالم بدگماں ہو جائیگا

حسرت نے اسی مضمون کو اور زیادہ نکھار دیا ہے شعر ملاحظہ ہو

وہ خواب ناز میں تھے اور نہ تھے لے شوق پابوسی　　نہ سمجھی پستیٔ ہمت تری اس لطف ایما کو

اگرچہ طرز ادا معنوی خصوصیات سے عبارت ہوتا ہے لیکن اس کی تاثیر لفظی استعمال کے

بعض مخصوص طریقوں سے پیدا ہوتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزل ایک طرح کا طلسم ہے غزل نگار شاعر اس طلسم کے بھیدوں کو جانتا ہے اس کو لفظوں کے استعمال کے ذریعہ ایسی قوتیں عطا کی گئی ہیں جن میں دوسرے اس کے شریک نہیں شاعرانہ لفظ انسانی ذہن کو اس کی بندشوں سے رہا کرتے ہیں اس سے بڑھ کر اثر آفرینی کا کوئی ذریعہ نہیں بعض ایسے الفاظ ہیں جن سے رمزی کیفیت کی اثر آفرینی ایک خاص صورت اختیار کر لیتی ہے مثلاً وہ جن سے رنگ و بو کے شعری محرکات کی تخلیق ہوتی ہے اردو غزل میں خاص تاثیر رکھتے ہیں رنگ اور بو دونوں میں بے پناہ ایمائی خاصیت موجود ہے چنانچہ اردو غزل گو شاعروں نے اس لطیف حقیقت کو ہر زمانہ میں محسوس کیا جدید شاعروں میں حسرت کے ہاں اس محرک شعری کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں بعض دوسروں کے یہاں بھی یہ احساس ملتا ہے چنانچہ [1] ہو

دیکھ کے دست و پائے نگارین چپ کے سے رہ جاویں نہ کیوں
منھ بولے ہے یارو گویا مہندی اس کی رچائی ہوئی (میر)

مشک عنبر طبلہ طبلہ کیوں نہ ہو کیا کام ہم دماغ آشفتہ ہیں زلف معنبر کے تری "
گل پیرہن نہ چاک کریں کیونکہ رشک ہے کس مرتبہ میں شوخ ہے اس کی قبا کا رنگ "

جرات کے اشعار ہیں

بو محبت کی نسیم آہ سے کھلتی ہے واں گرچہ سو پردوں میں جوں غنچہ چھپائی جائے
سنگھا بدن کو کہا کس مزے سے چتوں میں رہ بو دگی یہ کسی عطر کی بھی بو میں نہیں
ٹک لگ گیا گلے سے جو وہ گل تو اب مجھے جوں بوئے گل کرے ہے زخود رفتہ بو مجھے

غالب کے خیال میں پھول رنگ کے نشہ سے مست ہو کر اپنی بند قبا حسینوں کی طرح کھول دیتا ہے حسن تعلیل لاجواب ہے

نشۂ رنگ سے ہے واشدۂ گل مست کب بند قبا باندھتے ہیں
میں نے جنوں میں کی جو اسد التماس رنگ خونِ جگر میں ایک ہی غوطہ دیا مجھے

ظفر کا شعر ہے

[1] عطار کا سند دیجیے

شمشیر برہنہ مانگ غضب بالوں کی چمک پھر ویسی ہی
جوڑے کی گندھاوٹ قہر خدا بالوں کی مہک پھر ویسی ہی

رند کہتا ہے

خال عارض پہ گماں عنبر اشہب کا ہوا سونگھ کر زلف کی بو مشک ختن یاد آیا

محرک بو کا مضمون نسیم لکھنوی کے یہاں ملاحظہ ہو

چارہ گر سودا ہے بوئے زلف برہم کا مجھے قید کر زنجیر موج نکہت بر باد میں

برق کے یہاں یہ مضمون اس طرح ہے

ملتا ہے بوئے گل سے نشاں بوئے یار کا نقشہ ہے بوئے گل میں گل روئے یار کا
موج نسیم سے نہ پریشاں ہو کیوں دماغ دیوانہ ہوں میں نکہت گیسوئے یار کا
بڑھ گیا اور جنوں بو جو تمہاری آئی بن کے زنجیر ملا باد بہاری آئی
ممکن نہیں کہ رنگ جمے آفتاب کا رنگ بہار عارض زیبا کے سامنے

داغ کا شعر ہے

کیا صبا کوچۂ دلدار سے تو آتی ہے مجھ کو اپنے دل گم گشتہ کی بو آتی ہے

جلال نے بھی اسی مضمون کے شعر کہے ہیں

زلف یار کا تصور جنوں شوق کے لیے کس طرح سامان بہار مہیا کرتا ہے

بعد مدت اے جنوں سبزی بہار آنے کو ہے ہوش کھتے جانے کو بوئے زلف یار آنے کو ہے

جلال نے اس شعر میں بو کو محرک شعری کے طور پر عجب پیرایہ میں برتا ہے

وحشی وہ ہیں کہ ہم کو لگا لائی بوئے گل پوچھی بہار میں نہ کسی سے چمن کی راہ

ایک دوسرے شعر میں گل داغ عشق میں رنگ و بو کے محرک کو بڑی خوبی سے نکھارا ہے

کیا پھول ہے جلال گل داغ عشق بھی گر اس کی بو سے مست گر غش ہوں رنگ سے

حسرت نے رنگ و بو کے رمزی اور ایمائی اثر کو جس خوبی سے اپنے عاشقانہ کلام میں استعمال کیا ہے

اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ رنگ حیا، خوشبوئے حیا، خوشبوئے حسن، خوشبوئے آرزو، بوئے وفا اور خوشبوئے دلبری کے استعاروں اور رمزی علامتوں میں بلا کی ایمائی قوت ہے جس سے حسرت نے پورا فائدہ اٹھایا ہے

جان فزا تھی کس قدر یارب ہوائے کوئے دوست | بس گئی جس سے مشام آرزو میں بوئے دوست
ہو چکی اب ہم گرفتاران فرقت کو نصیب | آہ وہ خوشبو کہ تھی پروردۂ گیسوئے دوست

اس پوری غزل میں بو کے محرک شعری لپٹیں موجود ہیں

جس نے سونگھی ہو تری زلف سیہ کار کی بو | کیا پسند آئے اسے نافہ تاتار کی بو
آج تک جس سے معطر ہے محبت کا مشام | آہ کیا چیز تھی وہ پیرہن یار کی بو
بے پیے مست کئے دیتی ہے اے پیر مغاں | مے پرستوں کو ترے ساغر سرشار کی بو
ہوس انگیز تمنا ہے لب یار کا رنگ | روشنی بخش نظر ہے گلنار کی بو
دل دہی سے بھی تری بڑھ کے ہے کچھ روز افزوں | دلنوازی میں ترے نامۂ دلدار کی بو —
لبریز نور ہے دل حسرت زہے نصیب | اک حسن مشک فام کے شوق تمام کا
آشنا ہو کے بوئے یار سے ہم | سخت بیزار ہیں قرار سے ہم
میں اس طرۂ زلف شکیں کو حسرت | پئے غارت جان دوتا چاہتا ہوں
گیسوئے دوست کی خوشبو ہے دو عالم کی مراد | آہ وہ نکہت برباد کہ برباد نہیں
رونق پیرہن ہوئی خوبی جسم نازنیں | اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا
رنگ سونے میں چمکتا ہے طرحداری کا | طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا
یاد شہر و کوئے یار آنے لگی | آرزو کو بوئے یار آنے لگی
شوق مخمور ہوس ہونے لگا | نکہت گیسوئے یار آنے لگی
پیراہن کوئی اتارا نہ انھوں نے حسرت | وہ کہ خوشبوئے محبت سے ہم آغوش تھا
خوشبو ترے ملبوس کی لائی ہے کہاں سے | تجھ تک نہ ہوا تھا جو گذر باد صبا کا
سونگھی تھی جو اک بار وہ خوشبوئے گریباں | ابتک یہی اس بوئے گریباں کا نشاں ہے

کیا کیجئے بیاں اس تن نازک کی حقیقت — دامن میں ہی گل ہو تو لطافت میں ہے رنگ
پائی ہے جگہ پاک دامان نظر میں — خوشبوئے حیا نے تری چادر سے نکل کر
اک بار بس گیا جو کہیں ان کی باس میں — خوشبوئے حسن بر سوں رہی اس لباس میں
رفتہ رفتہ سٹ رہی ہے صر صر بیداد سے — رنگ میں بوئے وفا میں نکہت برباد کے

جلال کے یہاں بھی بوئے وفا کا مضمون ملتا ہے
تیرے وعدوں نے بدلیں سو رتیں بے اعتباری کی — کبھی بوئے وفا ٹھہرے کبھی رنگ حنا ٹھہرے

حسرت کے چند اور شعر سنئے
محتاج بوئے عطر نہ تھا جسم خوب یار — خوشبوئے دلبری تھی جو اس پیرہن میں تھی
محبوبی و رنگینی ہیں حسن و بدن تیرا — سرشار محبت ہے خوشبوئے دہن تیری
پیراہن اس کا ہے سادہ رنگیں — یا عکس مے سے ہے شیشہ گلابی
کیا کیا ہوس کو آتی ہے خوشبوئے آرزو — آنکھیں جب اپنے ملتے ہیں ان کی ردا سے ہم
کھول کر بال جو سوتے ہیں وہ شب کو حسرت — گھیر لیتی ہے انھیں زلف معبر کیا خو
تم نے بال اپنے جو پھولوں میں بسا رکھے ہیں — شوق کو اور بھی دیوانہ بنا رکھا ہے
وصل میں بوئے جسم یار کو آج — شوق سے پردۂ قبا نہ رہے
مشک و عنبر میں یہ تفریح کے ساماں کہاں — پیرہن ان سے بھی کچھ بڑھ کے ہے خوشبو تیرا
دامن حسن ترا خون شہادت نے میرے — عطر خوشبوئے محبت میں بسا کر دیکھا

رنگ و بو کے محرکات دوسرے شاعروں کے بیان میں بھی ملتے ہیں ثابت کے اشعار ملاحظہ ہوں
طرۂ گیسوئے جاناں تری نکہت کی قسم — میں نے دیکھا تھا مگر مشک ختن یاد نہیں
جذب شمیم زلف ہے دانہ و دام سے سوا — سیکڑوں دل کھنچ آئے ہیں گیسوئے مشک بار میں

شاد عظیم آبادی کہتے ہیں
کاکل جان غزا کی بو سونگھ چکی ہے اے صبا! — کچھ تو سمجھ کے ذکر کر عنبر و مشک و عود کا

جلیل کے شعر ہیں

عجب ادا سے چمن میں بہار آتی ہے　　کلی کلی سے مجھے بوئے یار آتی ہے

سونے میں کھل گئی ہو جو وہ زلف مشک بو　　کیا کیا ملا رہا ہوں نسیم سحر کو میں

چمن کے پھول بھی ترے ہی خوشہ چیں نکلے　　کسی میں رنگ ہے تیرا کسی میں بو تیری

جگر کے کلام میں رنگ و بو کے محرکات لستاًکم ملتے ہیں چند مثالیں یہ ہیں

جا بھی اے ناصح ناداں نہ کر اس کو بد نام　　ان جفاؤں سے تو خوشبوئے وفا آتی ہے

خرام رنگیں نظام رنگیں کلام رنگیں پیام رنگیں　　قدم قدم پر روش روش پر نئے نئے گل کھلا رہے ہیں

شباب رنگیں جمال رنگیں وہ سر سے پا تک تمام رنگیں　　تمام رنگیں بنے ہوئے ہیں تمام رنگیں بنا رہے ہیں

شعر غزل میں حسن ادا کا انحصار لفظوں کے خاص استعمال پر ہوتا ہے مثلاً بعض اوقات واحد کے بجائے جمع کا صیغہ لانے سے حسن ادا کو چار چاند لگ جاتے ہیں مولانا حسرت موہانی نے اپنے رسالہ "کائنات سخن" میں جمع کے استعمال کو محاسن سخن میں شمار کیا ہے (صفحہ ۱۶۲) لیکن انھوں نے یہ نہیں بتلایا کہ ایسا کیوں ہے؟ دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ تغزل کے لیے رمزی اور ایہامی کیفیت ضروری ہے صیغۂ واحد کے استعمال سے تفرد اور تعین کی صورت پیدا ہوتی ہے اور یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ شاعر نفس واقعہ کو بیان کرنا چاہتا ہے حالانکہ اس کے پیش نظر لفظوں کے معمولی معنی کے بجائے رمزی اور ... اثرات پیدا کرنا ہوتا ہے صیغۂ جمع سے چونکہ یہ مقصد بہتر طور پر حاصل ہوتا ہے اس لیے اس سے کلام کی تاثیر اور حسن میں اضافہ ہوتا ہے خود حسرت کی غزلیں ملاحظہ کیجیے جمع کے حسن استعمال نے اس کو کس قدر بلند کر دیا ہے

خوبرویوں سے یاریاں نہ گئیں　　دل کی بے اعتباریاں نہ گئیں

عقل صبر آزما سے کچھ نہ ہوا　　شوق کی بے قراریاں نہ گئیں

تھے جو ہر رنگ ناز ان کے ستم　　دل کی امیدواریاں نہ گئیں

... جب تک رہا نظارہ فروش　　صبر کی شرم ...یاں نہ گئیں

مر کے بھی خاک راہ یار ہوئے　　اپنی الفت شعاریاں نہ گئیں

حسن کی دلفریبیاں نہ گئیں عشق کی تابکاریاں نہ گئیں
سب نے چھوڑا مجھے مگر حسرت درد کی غمگساریاں نہ گئیں

ہم پر بھی مثل غیر ہیں کیوں مہربانیاں اے بدگماں یہ خوب نہیں بدگمانیاں
حیرت ہو یادگار زمان جنوں ہنوز باقی ہیں شوق یار کی تنک نشانیاں

خاموشیوں کا راز محبت وہ پا گئے گو ہم سے عرض حال کی جرأت نہ ہو سکی
اللہ رے چشم یار کی خوبی کہ خود بخود رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام
نشو و نمائے سبزہ و گل سے بہار میں شادابیوں نے گھیر لیا ہو چمن تمام
میری مجبوریاں شوق جفا سے باز رکھیں گی تیرا شوق ستم ظالم حیا ل امتحاں تک ہو
رنگینیوں کی جان ہو وہ پائے نازنیں اپنی نگاہ شوق جہاں سرکے بل گئی

جمع کا حسن استعمال ہر دور کے شاعر کے ہاں ملتا ہو قدما میں خاص طور پر میر صاحب کے یہاں اس کی کثرت سے مثالیں موجود ہیں مثلاً

جب تک ملے جلے سی جفائیں تھیں اٹھ سکیں کرنے لگے ہو اب تو ستم گاریاں بہت
یہ بے قراریاں نہ کبھو ان نے دیکھیاں جاں کاہیاں ہماری بہت سہل جانیاں
نہ بھائی ہماری تو قدرت نہیں کھنچیں میر تجھ سے ہی یہ خواریاں
کھینچتا ہو دلوں کو صحرا کچھ ہو مزا جوں میں اپنے سودا کچھ
جفائیں دیکھ لیا بے وفائیاں دیکھیں بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

مومن کے اشعار ملاحظہ ہوں

الجھے نہ زلف سے جو پریشانیوں میں ہم کرتے ہیں اس پہ نازادائیوں میں ہم
ظاہر ہو جرم شکوہ نہ ظاہر گناہ رشک حیران ہیں آپ اپنی پشیمانیوں میں ہم
مارے خوشی کے مرگئے صبح شب فراق کتنے سبک ہوئے ہیں گراں جانیوں میں ہم

داغ کے چند شعر ملاحظہ ہوں

صبر لے زاہد نا فہم نہ مے خواروں کا بخشنے والا بھی دیکھا ہی گنہ گاروں کا
سر شوریدہ کو تسکین دہیں ہوتی ہے مجھ پہ احسان ہی اس کوچہ کی دیواروں کا
دوش پہ اپنے جو صبا دے نے زلفیں چھوڑیں اور جی چھوٹ گیا آج گرفتاروں کا

نقل قول کے حسن استعمال سے بھی کلام میں بجائے تعین کے رمز و ابہام پیدا کرنا مقصود ہوتا ہی حالانکہ نثر میں اس کے بالکل خلاف ہی نثر میں نقل قول مطالب کی صفائی اور تعین کا سب سے زیادہ موثر ذریعہ ہی غزل میں اس سے رمزی کیفیت کو وسعت حاصل ہوتی ہی مثلاً

کہتے تو ہو "یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا" کہنے کی ہیں سب باتیں کچھ بھی نہ کہا جاتا میر
دل جلے جوں رو کر شبنم نے کہا گل سے اب ہم تو چلے یاں سے رہ تو جو رہا چاہے "
ٹھہرے ہیں ہم تو مجرم ٹک پیار کر کے تم کو تم سے بھی کوئی پوچھے تم کیوں ہوئے پیارے "
پڑے ہی بزم میں جس شخص پر نگاہ تری وہ منھ پھیر کے کہتا ہی "اف پناہ تری" جرأت
کہے کوئی گر اس سے ملئے کہ جرأت تمہارا طلب گار پیدا ہوا ہے
تو کہتا ہی وہ از رہ طعن ہاں جی یہی تو خریدار پیدا ہوا ہے "
جتاؤں درد محبت تو کس ادا سے کہے کرو نہ مجھ سے یہ باتیں دیوانہ پن کی سی "
اس چشم پہ آنکھ پڑتے ہی ہم نے کہا جادو بر حق ہی کرنے والا کافر "
کبھی جو یاد بھی آتا ہوں تو کہتے ہیں کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں غالب
میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں "
میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیئے غیر سے تہی سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں "
سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسش حال کہ یہ کہے کہ سر رہ گذر ہی کیا کہیئے "
رشک کہتا ہی کہ "اس کا غیر سے اخلاص حیف عقل کہتی ہی کہ وہ بے مہر کس کا آشنا "
نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ ہم ستمگر ہیں مجھے تو خو ہی کہ جو کچھ کہو بجا کہیئے "
نقش پائے رفتگاں سے آرہی ہے یہ صدا دو قدم میں راہ طے ہی شوق منزل چاہیئے آتش

کہہ رہی ہے حشر میں وہ آنکھ شرمائی ہوئی ہائے کیسی اس بھری محفل میں رسوائی ہوئی امیر مینائی

کہاں کہاں دل مشتاق دید نے یہ کہا وہ چمکی برق تجلی وہ کوہ طور آیا داغ

نگاہ ناز یہ کہتی ہے تیرا فگن کی کہ میں ہوں دل کے لیے تیر ہی گلو کے لیے جلیل

نقاب کہتی ہے میں پردۂ قیامت ہوں اگر یقین نہ ہو دیکھ لو اٹھا کے مجھے "

تھک کے بیٹھوں تو یہ کہتا ہے جنوں دو قدم کو چۂ رسوائی ہے "

میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر دریائے محبت کہتا ہے آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم شاد

مرغان قفس کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے آ جاؤ جو تم کو آنا ہو ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم "

محبت کیوں کرو گر ہو نہیں سکتی وفا مجھ سے یہ تم نے کیا کہا مجھ سے یہ تم نے کیا کہا مجھ سے حسرت

دیکھے نہ ہمیں کوئی محبت کی نظر سے کیا خوب یہ انداز تحکم ہے تمہارا "

وہ اب چھیڑ سے کہتے ہیں میرے غم نے مجھے نہ بے قرار کیا ہے نہ بے قرار کرے "

حال دل سے انہیں آگاہ کئے دیتے ہیں اس کبھی ہم کو خبر کیا تھی نہ کہنا دیکھو "

یہ کہہ کر دیا اس نے در د محبت جہاں ہم ہیں گے بے سامان ہوگا جگر

کہتی ہے بہ اب وسعت دیوانگی شوق منزل بھی جو آ جائے تو منزل نہ سمجھنا "

اس تبسم کے تصدق اس تجاہل کے نثار خود مجھی سے پوچھتے ہیں کون یہ دیوانہ ہے "

تلمیح بھی کنایہ اور استعارہ کی طرح رمز و ایما کو نکھارتی ہے اس میں بھی کنایہ کی طرح لازم و ملزوم میں واسطہ برقرار رہتا ہے جس کی لطافت کا یہ اقتضا ہے کہ تعقید کی تازگی کا متوقع رہتا ہے مثلاً

بے ستوں کیا ہے کوہکن کیسا عشق کی زور آزمائی ہے میر

مرگ مجنوں سے عقل گم ہے میر کیا دوانے نے موت پائی ہے "

آ کے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد نہ رہی دشت میں خالی مری جا میرے بعد "

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا غالب

عشق و مزدوری عشرت گہ خسرو کیا خوب ہم کو تسلیم نکو نامی فرہاد نہیں "

تکرار الفاظ بالعموم نثر اور شعر دونوں میں معیوب سمجھی جاتی ہے لیکن اگر لفظوں کی تکرار اور الٹ پھیر ایک خاص سلیقہ سے کی جائے جو رمزی اداس کو بڑھانے میں مدد دے تو کلام کی بلاغت اور حسن میں اضافہ ہوگا مثلاً

قطرہ قطرہ آنسو جس کی طوفاں طوفاں شدت ہے ۔ پارہ پارہ دل ہے جس میں تو وہ تو وہ حسرت ہے ۔ درد

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے ۔ تکلف بر طرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی ۔ غالب

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا ۔ لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں ۔ "

کس تجاہل سے وہ کہتا ہے کہاں رہتے ہو ۔ تیرے کوچہ میں ستم گار تیرے کوچہ میں ۔ شیفتہ

ہوئے ہیں عاشق بھی کن گلوں کے کہ خود ہی شاکی ہیں جن گلوں کے

نہیں ہے وعدہ میں ان گلوں کے وفا کی بو اتیا زکا رنگ ۔ جلال لکھنوی

دعا سے کچھ نہ ہوا التجا سے کچھ نہ ہوا ۔ بتوں کے عشق میں یا خدا سے کچھ نہ ہوا

بھری تو تھی مگر اپنے اثر کو لا نہ سکی ۔ گئی تو تھی مگر آہ رسا سے کچھ نہ ہوا ۔ مضطر

کہاں گلوں کے وہ تختہ وہ لالہ زار کہاں ۔ بہار ہیں تو نظر لگ گئی بہار کہاں ۔ شاد

کوئی ان کی بزم جمال سے کہ اٹھا خوشی سے کہاں اٹھا

جو کبھی اٹھا بھی اٹھانے سے تو اس طرف نگراں اٹھا ۔ حسرت

تازگی بیان اور ندرت مضمون کا بعض دفعہ یہ اقتضاء ہوتا ہے کہ شعر کے چند لفظوں کو حذف کر دیا جائے اور مطلب کو اس طرح بیان کیا جائے کہ سامع کا ذہن خود بخود اس کمی کو پورا کر دے مثلاً

بدنام ہو گے جانے بھی دو امتحان کو ۔ رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

موئے دلبر سے مشک بو ہے نسیم ۔ حال خوش اس کے خستہ حالوں کا ۔ میر

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل ۔ میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا ۔ مومن

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے ۔ صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں ۔ "

شکوہ ہے غیر کی کدورت کا ۔ سو مرے خاک میں ملانے کو ۔ "

کیوں ردّ قدح کرے ہے زاہد مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے غالب

دوستدار دشمن ہے اعتماد دل معلوم آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

کل تک یہی گلشن تھا صیاد بھی بجلی بھی دنیا ہی بدل دی ہے تعمیر نشیمن نے فانی

بعض اوقات حذف کے بجائے مضمون کو دیدہ و دانستہ طول دیا جاتا ہے جو مقصود بالذات نہیں ہوتا لیکن چونکہ اس سے ایمائی اثر حاصل ہوتا ہے اس لیے کلام کی تازگی اور حسن میں اضافہ ہوتا ہے مثلاً غالب کو یہ کہنا ہے کہ فلک کے ظلم معشوق کے ستم سے کم نہیں اس مضمون کے لیے یہ انداز اختیار کرتے ہیں

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسدؔ جفا میں اس کی ہے انداز کارفرما کا

اسی مضمون کا صبا لکھنوی کا یہ شعر ہے جو کسی طرح غالب کے شعر سے کم نہیں

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

مومن خاں جذبۂ رشک کے تحت اپنے محبوب سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ غیر سے سرگوشیاں نہ کیجیے بلکہ میری طرف التفات فرمائیے لیکن بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ کہہ رہے ہیں کہ غیر کی طرف پہلے متوجہ ہو لیجیے حالانکہ ان کا مدعا اس کے بالکل برخلاف ہے

غیر سے سرگوشیاں کر لیجیے پھر ہم بھی کچھ آرزوہائے دل رشک آشنا کہنے کو ہیں

مقصود صرف اپنے گریبان کے چاک کی وسعت بتانا ہے لیکن اس ضمن میں دست جنوں کے صدقے جاتے ہیں اور یہ انداز بیان اختیار کرتے ہیں

دست جنوں کے جائیے صدقے کہ چین سے پھیلائے پاؤں ہم نے گریباں کے چاک میں

رمزی اور ایمائی اثر آفرینی کے ضمن میں شاعر بعض وقت ایسا انداز بیان اختیار کرتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کبھی تکلم سے غیبت کی طرف کبھی غیبت سے تکلم کی طرف کبھی خطاب سے تکلم کی طرف اور کبھی خطاب سے غیبت کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے کبھی مفرد اور جمع کے صیغہ ایک ہی شعر میں برتے جاتے ہیں دراصل یہ سب رمزی طلسم کے کرشمے ہیں اور اس کے سوا کچھ نہیں نثر میں یہ سب باتیں عیب ہیں اور غزل میں انھیں حسن ادا کی سند حاصل ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں

اب کے جو تیرے کوچہ میں جاؤں گا تو سنیو پھر جیتے جی اس راہ وہ بدنام نہ آیا میر
کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گذر گیا کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے ذوق
وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے تم نے کیوں سونپی ہے اپنے در کی دربانی مجھے غالب
عجب الٹے ملک کے ہیں اجی آپ بھی تم سے کہہ کبھی بات کی جو سیدھی تو ملا جواب الٹا انشا
ترے در سے اب ہم سفر کر چلے جیو تم کہ اب ہم گذر کر چلے میرسوز
فصل بہار آئی پیو صوفیو شراب بس ہو چکی نماز مصلیٰ اٹھائیے آتش
پھنس گئے تم نہ سنی حضرت دل بات مری بندگی آپ کو اے قبلہ حاجات میری امیر
ادھر آؤ اس بات پر بوسہ لے لوں میرے سر کی جھوٹی قسم کھانے والے داغ

تخیل کبھی معمول کے خلاف مستقبل کے معنی ماضی کے ساتھ ساتھ وابستہ کر دیتا ہے تاکہ ایہام و رمز پیدا ہو، مثلاً

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہل جہاں دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں
مجھ گنہ گار کو جو بخش دیا تو جہنم کو کیا دیا تو نے داغ

ایک ہی شعر میں مفرد اور جمع کے استعمال پر بحث کرتے ہوئے مولانا حسرت موہانی نے نکات سخن میں لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے استاد منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی کو ابتدائی مشق کے زمانہ میں اپنی ایک غزل اصلاح کے لیے بھیجی تھی جس کا مطلع یہ تھا

ملتے ہیں اس طرح سے کہ گویا خفا نہیں کیا آپ کی نگاہ سے ہم آشنا نہیں

منشی صاحب مرحوم نے پہلا مصرعہ بدل کر یوں کر دیا "ملتے ہو اس ادا سے کہ گویا خفا نہیں" اور دوسرا مصرع جیسا تھا ویسا رہنے دیا۔ گویا ان کے نزدیک تم کے ساتھ آپ کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہ تھا اگرچہ حسرت کا خیال ہے کہ تم اور آپ اور تو اور تم کا اجتماع قابل احتراز ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس باب میں ان کے استاد کا مسلک غزل کی ٹکنک کے نقطۂ نظر سے بہتر اور صحیح معلوم ہوتا ہے۔ مفرد اور جمع کے صیغوں کے اجتماع سے شعر کی رمزی کیفیت بڑھ جاتی ہے اور کسی قسم کی تعقید نہیں پیدا ہوتی۔ مطلب میں تعین کے بجائے ایک قسم کا ایہام

اور پھیلاؤ آجاتا ہے جس سے شعری احساس لطف اندوز ہوتا ہے لیکن رمزی علامتوں کو برتنے میں اگر خاص قرینے سے کام نہیں لیا گیا تو لطف سخن حاصل ہونا تو کجا وہی بات ذوق پر گراں گذرے گی۔

یہی حال رعایت لفظی کا ہے اگر اس سے شعر کی رمزی اور ایمائی کیفیت بلاکسی تکلف کے بڑھ جائے تو سامع اس سے لطف اندوز ہوگا ورنہ اگر یہ احساس پیدا ہو کہ شاعر نے تکلف اور تصنع سے کام لیا ہے تو طبیعت اس کی طرف کبھی بھی مائل نہ ہوگی مندرجہ ذیل لفظی رعایتیں اس قسم کی ہیں

توڑ دل کا نہ میرے مار کے پتھر شیشہ — سنگدل ہم نے بنایا ہے یہ مرمر شیشہ — شاہ نصیر

کیا ہے تازہ نخل غم کو آہیں سرد بھر بھر کر — بڑی محنت سے میں نے یہ ثمر جاڑے میں پالا ہے — امانت

دے دوپٹہ تو اپنا ململ کا — ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا — ناسخ

ان مثالوں کے خلاف ایسی مثالیں بھی ہیں جن میں رعایت لفظی جدت ادا میں جان ڈال دیتی ہے اور شعر کا معنوی اور رمزی اثر کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔

رہے سنگِ مزار پر فرہاد — رکھ کے شیشہ کہے ہے یا اُستاد — میرؔ

گرچہ آوارہ جوں صبا ہیں ہم — لیک لگ چلنے میں بلا ہیں ہم — "

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا — بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا — غالب

غم ہر چند کہ ہے برق خرام — دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی — "

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں — ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے — "

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا — جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے — "

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے — تمہارے آئیو اے طرہ ہائے خم بہ خم آگے — "

اس قسم کی مثالوں سے غالب کا دیوان بھرا پڑا ہے اور دوسرے شاعروں کے ہاں بھی کثرت سے ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں رعایت لفظی سے کلام کی شگفتگی بلندی اور تاثیر میں اضافہ ہوا ہے۔

جس طرح حسن کو محسوس کیا جاتا ہے لیکن اس کی تعریف نہیں کی جاسکتی اسی طرح شعر کے حسن ادا کو بھی محسوس کرنا ممکن ہے۔ خیال میں محسوسات کی جو صورتیں جمع ہوتی ہیں ان کے اظہار پر جب تک

پوری قدرت نہ ہو اس وقت تک طرز ادا میں جدت اور دلکشی نہیں آسکتی حسن ادا کے لیے لفظی اور معنوی دونوں خوبیاں درکار ہیں وہی معمولی باتیں ہیں جنھیں سب کہتے ہیں ایک کے کہنے کا اثر ہوتا ہے دوسرے کے کہنے سے کسان پر جوں تک نہیں رینگتی۔

قطرۂ اشک کا مضمون پیش پا افتادہ ہے لیکن غالب نے اس مضمون میں ندرت اور نزاکت کی رنگا رنگی سمو دی ہے وہ کہتا ہے کہ قطرۂ اشک کی قدر و قیمت گہر سے زیادہ ہے اس مضمون کو صاف طور پر بیان کرنے کے بجائے پہلے یہ دعویٰ پیش کیا کہ جتنی ہمت ہوگی اتنی ہی توفیق ہوگی یہ قطرہ کی پست ہمتی ہے کہ وہ گہر بننے پر قناعت کرتا ہے۔ اگر اس کا حوصلہ بلند ہوتا تو اس کو انسانی آنکھ میں جگہ مل سکتی تھی جو اس کے رتبہ کی معراج ہوتی شعر میں دعویٰ سے زیادہ اہمیت ثبوت کو حاصل ہے جس میں رمزیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے کہتا ہے۔

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے — آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

اس میں شبہ نہیں کہ غزل میں حسن ادا کے لیے جو قدر مشترک ہے وہ رمزی اثر آفرینی ہے چاہے لفظوں سے کوئی بلند یا گہرے معنی نہ نکلتے ہوں یا خود لفظ خوشنما نہ ہوں لیکن اگر شاعر اپنے فکری اور جذباتی محسوسات کی صورتوں میں ذہنی تصرف پر قادر ہو گیا ہے تو ضرور ہے کہ وہ ایمائی اثر پیدا کر سکے گا۔ محسوسات کی مختلف صورتوں میں ذہنی تصرف اس واسطے ضروری ہے کہ وہ انھیں حقیقت سے مجاز کی طرف اور تصریح سے کنایہ کی طرف لے جانا چاہتا ہے کہ بغیر اس کے شعری بلاغت پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کے ساتھ اس کا اہتمام بھی ہونا چاہیئے کہ رمزی اور مجازی معنی حقیقت سے بالکل منقطع تو نہیں ہو سکتے۔ مجاز اور رمز کی دنیا میں جس سے غزل عبارت ہے اور جس میں تصرف جائز ہی نہیں فرض ہے تاکہ حسن ادا جلوہ گر ہو غزل کے لفظوں کے ظاہری معنی کبھی بھی مقصود بالذات نہیں ہو سکتے اور نہیں ہونے چاہئیں۔ اگر ان سے رمزی اثر پیدا ہو جائے تو بس اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہیئے

میر صاحب ہوں یا غالبؔ مومن ہوں یا ذوقؔ حسرتؔ ہوں یا جگرؔ ان سبھوں میں تغزل کے بعض مشترک اجزا ملتے ہیں وہ سب اپنے دل کے اندرونی تجربوں کو بیان کرتے ہیں۔ تجربے کے لیے ضروری نہیں کہ وہ طویل

ایک لمحہ کا تجربہ زیادہ قیمتی ہو سکتا ہے جو کچھ زیادہ عرصہ تک محسوس کیا گیا ہو۔ اور غیبی جذب کا نتیجہ ہو۔ غزل کا ایک شعر ایک خاص تجربہ کا اظہار ہے۔ تغزل کے لیے تو وہ تجربے زیادہ قدر و قیمت رکھتے ہیں جو حسن و عشق کی دنیا میں پیش آئیں کہ اس کے لیے یہی ابدی حقائق ہیں۔ اندرونی تجربے کو تفصیل اور وضاحت سے بیان نہیں کیا جا سکتا اور نہیں کرنا چاہیے۔ چونکہ اثر آفرینی میں ابہام مقصود ہوتا ہے اس لیے تغزل میں رمز و ایما کا اسلوب برتا جاتا ہے لیکن چونکہ یہ مبہم کیفیت اندرونی تجربے پر مبنی ہوتی ہے اس واسطے اس کا اخلاص غیر مشتبہ ہے بعض غزل گو شاعروں کے ہاں دوسروں کے مقابلے میں خارجیت کا عنصر زیادہ ملتا ہے جیسے مصحفی اور جرأت وغیرہ ان دونوں کا تغزل اعلیٰ پایہ کا ہے لیکن ان کو وہ رتبہ کبھی نہیں ملا جو میر یا غالب کو نصیب ہوا۔ خارجیت لازمی طور پر بیان کی صفائی اور منطقی تسلسل کی محتاج ہے جو تغزل کے لیے سازگار نہیں جس کا خمیر رمز و ابہام سے بنا ہے۔

غزل گو شاعر کے دل کو رموز و ابہام اس لیے عزیز ہیں کہ وہ جس قسم کا اثر پیدا کرنا چاہتا ہے وہ انھیں سے ممکن ہے۔ دن کی روشنی کے مقابلے میں رات کی چاندنی جذبات پرستوں کو کیوں پسند ہے؟ بقول فرانسیسی مفکر ہوکر موکیو اس کی وجہ یہ ہے کہ جذبہ ابہام چاہتا ہے نہ کہ وضاحت خارجی عالم کی اشیا چاندنی میں ... میں عجیب و غریب پراسرار کیفیت پیدا کر دیتی ہیں۔ ان کے خد و خال ہی بدل جاتے ہیں وہ شخص جو مکان کی پیمائش کرنا چاہتا ہے یا درختوں کی نباتی خواص کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے اسکو چاہیے کہ دن کی روشنی میں انھیں دیکھے لیکن وہ شخص جسکو یہ مطلوب نہیں وہ چاندنی رات میں مکانوں اور درختوں کی مجموعی اثر آفرینی سے جتنا لذت اندوز ہوگا اتنا دن کی روشنی میں نہیں ہو سکتا معلوم ہوتا ہے کہ جذبہ حقیقت اور خیال کی دھوپ چھاؤں میں جھولا جھولنا پسند کرتا ہے دھوپ چھاؤں ہو یا فطرت کی کوئی دوسری مبہم صورت جو دل کے تاروں کو چھیڑے اہل نظر کو محبوب ہوتی ہے۔ صبح پو پھٹنے سے قبل اور غروب کے شفقی دھندلکے میں جب تاریکی اور روشنی ہم آغوش ہوتی ہیں دل کیوں پراسرار کیفیت محسوس کرتا ہے؟ صبح اور شام کی مبہم کیفیت روحانی تزکیہ کے لیے موزوں خیال کی جاتی ہے دنیا کے ہر مذہب میں ان اوقات کے لیے عبادتیں رکھی گئی ہیں فطرت کا ابہام جذبات میں تحیر کی آمیزش کرتا اور ان کی شدت کو بڑھاتا ہے۔ حسن و عشق کی رنگینیوں اور کیفیتوں کی تکمیل کے لیے سوا اس فضا کے کوئی اور دوسری سازگار نہیں ہو سکتی۔

تغزل کے ابہام کی بھی یہی توجیہ ہے۔ ابہام اس کا عیب نہیں ہنر ہے۔ (۲۰ جنوری ۱۹۳۶ء)

خورشید الاسلام

امراؤ جان ادا

پریم چند بجائے خود ایک ادارہ ہیں اور ان کی ناول نگاری ایک معنی میں ادبی سیاسی اور لسانی تحریک ہی ان کی مقبولیت ایک ایسا دائرہ ہی جس کا مرکز دریافت کرنا آسان بات نہیں ان کے ناولوں کے نام سبھی جانتے ہیں مگر ہماری زبان میں ایک ناول ایسا بھی ہی جو فن کے اعتبار سے خاصہ کی چیز سمجھا جاتا ہی پھر بھی اس کے نام سے کم لوگ واقف ہیں' اس ناول کا نام "امراؤ جان ادا" ہی آپ چاہیں تو اسے "خانم" بھی کہہ سکتے ہیں "یادِ ایام" بھی کہہ سکتے ہیں اس کتاب کا نام "رسوائیاں" بھی ہو سکتا ہی۔ نام اکثر ستم ظریف ہوتے ہیں اور ان سے کبھی دھوکا نہ کھانا چاہیے اس کا نام امراؤ جان ہی لیکن امراؤ جان کہانی نہیں ہی امراؤ جان اس ناول کا ایک کردار ہی مگر وہ کوئی ایسا کردار نہیں ہی جس کے شہر اس زندگی کے تمام دائروں اور گوشوں پر حاوی ہوں جو فن کار کے جادو سے اس کتاب میں نظر بند ہوگئی ہی وہ دیکھنے والی آنکھ ہی، مبصر ہی' وہ خود تماشہ بھی ہی اور تماشائی بھی مگر وہ اس کتاب کا موضوع نہیں ہی ناول کو سمجھنے اور پرکھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہوتا ہی کہ اس کا موضوع کیا ہی ورنہ فن اور اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا ناممکن ہی موضوع اپنی وسعتیں رکھتا ہی اپنے حدود بھی رکھتا ہی وہ اپنا ساز و سامان بھی رکھتا ہی اس کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں ان تقاضوں کو پورا کرنا وقت کی نبض شناسی کا لحاظ رکھنا اور فطرت کی ان لہروں کو بہتے ہوئے دکھانا جو گرد و پیش مزاج اور واقعات کی ساخت و پرداخت کرتی ہیں یہی فن کار کا کام ہی موضوع سے واقفیت حاصل کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنے زندگی اور فن کے مطالبوں کو پا گئے ہیں ان کی کسوٹی پر ہم تصویر' تفصیل' تصادم اور ترجمانی کو پرکھ سکتے ہیں سوال یہ ہی کہ اس ناول کا موضوع کیا ہی؟

رسوا ابتدا ہی میں ہمارا تعارف امراؤ جان سے اس طرح کراتے ہیں" اسی کمرہ کے برابر

ایک کمرہ تھا اس میں ایک طوائف رہتی تھی بود و باش کا طریقہ اور رنڈیوں سے بالکل علیحدہ تھا نہ کمرہ پر
کسی نے سرراہ بیٹھے دیکھا نہ وہاں کسی کی آمدورفت تھی دروازوں پر دن رات پردے پڑے رہتے تھے
چوک کی طرف نکاس کا راستہ بالکل مقفل رہتا تھا گلی کی جانب ایک اور دروازہ تھا اسی سے نوکر چاکر
آتے جاتے تھے اگر کبھی کبھی رات کو گانے کی آواز نہ آیا کرتی تو یہ بھی نہ معلوم ہوتا کہ اس کمرہ میں کوئی رہتا
بھی ہے کہ نہیں جس کمرہ میں ہم لوگوں کی نشست تھی اس میں ایک چھوٹی سی کھڑکی لگی تھی مگر اس میں کپڑا
پڑا ہوا تھا ... اتنے میں میں نے ایک شعر پڑھا اس کھڑکی کی طرف سے واہ کی آواز آئی میں چپ
ہو گیا ... منشی محمد حسین نے پکار کر کہا غائبانہ تعارف ٹھیک نہیں "ابھی قصہ شروع نہیں ہوا
ہو نہ مرزا نے شاعرہ کی محفل جمائی ہو ہم امراؤ جان کے ہمسایہ میں لے جائے گئے اتنے میں رسوا ہمیں
پاس آنے کا اشارہ کرتے ہیں ہم رسوا کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر دراز سے جھانکتے ہیں اور ہمیں امراؤ جان
کے بارے میں چند ضروری باتیں معلوم ہو جاتی ہیں وہ ایک طوائف ہو اس کی بود و باش پردہ والیوں
کی سی ہو موسیقی سے لگاؤ رکھتی ہو اس کے بعد امراؤ جان شاعرے میں آتی ہیں یا ترغیب دے کر
لائی جاتی ہیں اور اپنی غزل پیش کرتی ہیں

منشی صاحب "اچھا وہ مطلع کیا تھا"؟

امراؤ - "میں عرض کئے دیتی ہوں"

کعبہ میں جا کے بھول گیا راہ دیر کی ایمان بچ گیا مرے مولا نے خیر کی

منشی صاحب - خوب کہا ہو!

خاں صاحب - اچھا مطلع کہا ہو مگر "بھول گیا" کیوں؟

امراؤ جان - تو خاں صاحب! کیا میں ریختی کہتی ہوں؟

اب وہ عبارت دیکھئے جہاں اصل قصہ کا آغاز ہوتا ہو "ہاں اتنا جانتی ہوں کہ فیض آباد
میں شہر کے کنارے کسی محلہ میں میرا گھر تھا میرا مکان پختہ تھا آس پاس کچھ کچے مکان کچھ جھونپڑے
کچھ کھپریلیں رہنے والے بھی ایسے ہی ویسے لوگ ہوں گے ... میرے ابا بہو بیگم صاحب کے مقبرہ پر

نوکر تھے۔ ابا جب شام کو نوکری پر سے آتے تھے اس وقت کی خوشی ہم بھائی بہنوں کی کچھ نہ پوچھیے میں کمر سے لپٹ گئی بھائی ابا ابا کرکے دوڑا دامن میں چھپ گیا ابا کی باچھیں مارے خوشی کے کھلی جاتی ہیں دلاور خاں جس کا مکان ہمارے مکان سے تھوڑی دور پر تھا ہوا ڈکیتوں سے ملا ہوا تھا ابا سے سخت عداوت تھی۔

ان اقتباسات سے ہمیں امراؤ جان کے آغاز اور انجام دونوں سے متعلق چند ضروری خبریں مل جاتی ہیں پیدائش کے بعد اور موت سے پہلے وہ کیا ہے؟ کس ماحول میں اس نے اپنی آنکھیں کھولیں؟ اور اب کس منزل پر آن ٹھہری ہے؟ یہی نہیں بلکہ ہمیں خفیف سا اندازہ ان بھول بھلیوں کا بھی ہو جاتا ہے جس سے امراؤ جان کو گذرنا پڑا ہوگا اور ان چھوٹی چھوٹی نرم نرم کہانیوں کا بھی جن کا تانا بانا ایک خوش مذاق طوائف کے گرد بنا جا سکتا ہے گویا مرزا صاحب قصہ کے ترتیبی منظر اور اس کی باقاعدہ تمہید ہی میں ہمیں امراؤ جان ادا سے اس طرح متعارف کرا دیتے ہیں کہ اس کی زندگی میں کوئی راز باقی نہیں رہتا۔ ہمارے دل و دماغ میں تجسس کی کوئی اونچی لہر اٹھتی ہے اور نہ ہمیں کوئی اس بات کی توقع ہوتی ہے کہ آئندہ چل کر اس کی زندگی میں کچھ ایسے انکشافات آئیں گے جو ہماری تسکین کا باعث یا تحیر کا سامان ہوں گے اوپر دئے ہوئے چند ٹکڑوں کی مدد سے ہم کئی منزلیں طے کر جاتے ہیں امراؤ جان ایک طوائف تھی اب تائب ہو چکی ہے شعر و سخن کا ذوق رکھتی ہے ادب کے چند اصناف سے واقف ہے خود شاعرہ ہے۔ بچپن ایک شریف متوسط گھرانے میں گذرا۔ یہاں اس کا نام امراؤ جان نہیں کچھ اور ہوگا دلاور خاں کی اس کے باپ سے دشمنی تھی اس نے اس معصوم گھر کی چہار دیواری سے نکال کر ایک ایسی دنیا میں پھینک دیا جہاں دوزخ مہکتے ہیں اور فردوس خاموش ہیں۔

اس خاکہ پر ہماری آنکھیں جم نہیں جاتیں اور ہم اس کی تہوں کو کھولنے اور اس کے بھید کو ٹٹولنے کی بجائے ادھر ادھر دیکھنا شروع کرتے ہیں مگر اس سے پہلے کہ ہم اس تلاش پر آمادہ ہوں اور اپنی نگاہ کے دامن کو دور تک پھیلائیں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے دعوی کے ثبوت میں ایک مقام اور دیکھتے چلیں البتہ اس کے لیے جست لگانا ضروری ہے یہ وہ جگہ ہے جہاں کہانی

میں چوتھائی ہو چکی ہے امراؤ فیض آبادیں ہے صدیوں بعد زمانہ نے ایک ایسی کروٹ لی ہے کہ سخت و ست ہموار ہو گئے ہیں غدر کی آگ دب ہو چکی ہے مگر کہیں کہیں چنگاریاں اٹھتی دکھائی دیتی ہیں امراؤ جان زندگی کی گردان کئے جا رہی ہے اپنے وطن میں ہے مگر سب کے لیے بیگانہ ہے اب یہ اقتباس دیکھئے ' دو دن کے بعد ایک مجرا آگیا اس کی تیاری کرنے لگی جہاں کا مجرا آیا تھا وہاں گئی محلہ کا نام یاد نہیں مکان کے پاس بہت بڑا پرانا املی کا درخت تھا اسی کے نیچے تم گیرتا نا گیا تھا اس مقام کو دیکھ کر وحشت سی ہوتی تھی دل اندام آتا تھا کہ یہیں میرا مکاں ہے یہ املی کا درخت وہی ہے جس کے نیچے میں کھیلا کرتی تھی ...... ایک مکان کے دروازہ کو غور سے دیکھا کی دل کو یقین ہو گیا تھا کہ یہی میرا مکان ہے جی چاہتا ہے کہ مکان میں گھسی چلی جاؤں ماں کے قدموں پر گروں وہ گلے لگالیں گی مگر جرات نہ ہوتی تھی . پھر جی کہتا تھا ہائے کیا غضب ہے صرف ایک دیوار کی آڑ ہے ادھر میری اماں بیٹھی ہوں گی اور میں یہاں ان کے لیے تڑپ رہی ہوں ایک نظر صورت دیکھنا بھی ممکن نہیں۔

اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ ایک عورت نے آکر پوچھا " تمہیں لکھنؤ سے آئی ہو ؟"

میں ۔ "ہاں"! اب تو میرا کلیجہ ہاتھوں اچھلنے لگا۔

عورت ۔ "اچھا تو ادھر چلی آؤ۔ تمہیں کوئی بلاتا ہے"

میں ۔ "اچھا" کہہ کر اس کے ساتھ چلی ایک ایک پاؤں گویا سو سو من کا ہو گیا تھا قدم رکھتی کہیں تھی پڑتا کہیں تھا .. وہ عورت اس مکان کے دروازہ پر مجھ کو لے گئی جسے میں اپنا مکان سمجھے ہوئے تھی اس مکان کی ڈیوڑھی میں ایک چارپائی پر مجھ کو بٹھا دیا۔ اندر کے دروازہ پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا اس کے پیچھے دو تین عورتیں آکر کھڑی ہوئیں .

ایک ۔ "لکھنؤ سے تمہیں آئی ہو؟"

میں ۔ "جی ہاں"!

دوسری ۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

میں ۔ (جی میں تو آیا کہہ دوں امیرن مگر پھر دل کو تھام کے) "امراؤ جان"

پہلی ۔ "تمہارا وطن خاص لکھنؤ ہے؟"
میں ۔ (اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا آنسو نکل پڑے) اصلی وطن تو یہی ہے جہاں کھڑی ہوں"
پہلی ۔ "تو کیا بنگلے کی رہنے والی ہو؟"
میں "(آنکھوں سے آنسو جاری تھے بہ مشکل جواب دیا) جی ہاں"
دوسری۔ "کیا تم ذات کی پتریا ہو؟"
میں ۔ ' ذات کی پتریا تو نہیں ہوں۔ تقدیر کا لکھا پوری کرتی ہوں"
پہلی ۔ (خود رو کر) "اچھا تو روتی کیوں ہو آخر کہو تم کون ہو؟"
میں (آنسو پونچھ کر) کیا بتاؤں کون ہوں، کچھ کہتے بن نہیں پڑتا۔"

اتنی باتیں میں نے بہت دل سنبھال کر کی تھیں اب بالکل تاب ضبط نہ تھی سینہ میں دم رکنے لگا تھا۔

اتنے میں دو عورتیں پردے کے باہر نکلیں ایک کے ہاتھ میں چراغ تھا اس نے میرے منھ کو ہاتھ سے تھام کر کان کی لو کے پاس غور سے دیکھا دوسری کو دکھایا اور کہا "کیوں ہم نہ کہتے تھے وہی ہے" دوسری۔ "ہائے میری امیرن" کہہ کے لپٹ گئی۔ دونوں ماں بیٹیاں چیخیں مار مار کر رونے لگیں ہچکیاں بندھ گئیں۔

دوسرے دن شام کو کوئی دو گھڑی رات گئے ایک جوان سا آدمی سانولی رنگت کوئی بیس بائیس کا سن، پگڑی باندھے، سپاہیوں کی ایسی وردی پہنے میرے کمرے پر آیا میں نے حقہ بھروایا پان دان میں پان نہ تھے ماما کو چپکے سے بلا کے کہا پان لے آؤ۔ اتفاق سے اور کوئی بھی اس وقت نہ تھا کمرہ میں میں ہوں اور وہ ہے۔

جوان ۔ "کل تمہیں مجرے کو گئی تھیں؟" یہ اس تیور سے کہا کہ میں جھجک گئی۔
میں ۔ "ہاں" اتنا کہہ کر اس کے چہرے کی طرف جو دیکھا یہ معلوم ہوتا تھا کہ آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔

جوان۔ (بھر پیچ کرکے) "خوب گھرانے کا نام روشن کیا"!

میں۔ "اب مجھی یہ کون شخص ہے، اس کو تو خدا ہی جانتا ہے"۔

جوان۔ "ہم سمجھے تھے کہ تم مرگئیں تم اب تک زندہ ہو"۔

میں۔ "بےغیرت زندگی تھی نہ مری۔ خدا کہیں جلد موت دے"

جوان۔ "بےشک اس زندگی سے موت لاکھ درجہ بہتر تھی تمہیں تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا تھا کچھ کھا کر سو رہی ہوتیں"

میں۔ "خود اتنی سمجھ نہ تھی نہ آج تک کسی نے یہ نیک صلاح دی۔ اب سہی"

جوان۔ "اگر ایسی ہی غیرت دار ہوتیں تو اس شہر میں کبھی نہ آتیں اور آئی بھی تھیں تو تمہیں اس محلہ میں مجھے کو آنا تھا جہاں کی رہنے والی تھیں"۔

میں۔ "ہاں اتنی خطا ضرور ہوئی مگر مجھے کیا معلوم تھا"

جوان۔ "اچھا اب تو معلوم ہوگیا"،

میں "اب کیا ہوتا ہے"؛

جوان (بہت ہی غصہ ہوکر) اب کیا ہوتا ہے اب کیا ہوتا ہے اب۔ (چھری کمر سے نکال کے مجھ پہ جھپٹا دونوں ہاتھ پکڑ کے گلے پہ چھری رکھ دی) یہ ہوتا ہے! "اتنے میں ماما بازار سے پان لے کر آئی اس نے جو یہ حال دیکھا لگی چیخنے۔ ارے دوڑو۔ بیوی کو کوئی مارے ڈالتا ہے"!!

جوان (چھری گلے سے ہٹا کر ہاتھ چھوڑ دے)"عورت کو کیا ماروں اور عورت بھی کون بُری" اتنا کہہ کر ڈاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

یہ اقتباس خاصہ طویل ہے لیکن اس کا حوالہ بہت ضروری تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس ٹکڑے میں ڈرامہ کی توانائی ہے، یہ سنسنی خیز بھی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں امراؤ جان کی پچھلی زندگی کا سارا خون کھنچ آیا ہے۔ اس ڈرامائی ٹکڑے میں امراؤ جان کے دل و دماغ کی الجھن نظر آتی ہے۔ دماغ خود ایک کردار کی حیثیت سے کام کرتا ہے وہ کہیں جھجکتا ہوا آگے بڑھتا اور بڑھ کر پیچھے ہٹتا ہوا پردوں کو چیرتا

اور دیواروں کو گرانے کا حوصلہ کرتا ہوا، خود سے دور، دوسروں سے متصادم ہوتا ہوا اپنی شکست کا احساس
کرتا اور آنسوؤں میں تحلیل ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے نوجوان جائی سے امراؤ کا سامنا ایک میزان ہے جس میں
قدرت اس کے اعمال تولتی ہے وہ نوجوان امراؤ کا ماضی ہے تازہ، شاداب زندگی کی پاکیوں سے چور، بے فکر
جس کا ہر عمل برگزیدہ ہے کیونکہ وہ گناہ کے تصور سے آشنا نہیں مگر یہ ماضی تنگ بھی ہے اس میں زندگی کی
وسعتیں نہیں امراؤ جان کا نفس اس کا حال ہے جو گھائل ہے بھی اور نہیں بھی جس میں سرشاریاں ہیں بھی
اور نہیں بھی جس میں جیت بھی ہوتی ہے اور ہار بھی ہوتی ہے جس میں عمل کا میدان بہت وسیع ہے مگر
ہر سانس میں گناہ کا احساس ہوتا ہے اس تناتنی یا تصادم میں امراؤ اپنے نفس کی بھینٹ چڑھانے پر
آمادہ نظر آتی ہے اس کے گلے پر چھری رکھ دی جاتی ہے اور وہ اس کی گرمی سے پگھلتی ہوئی معلوم
ہوتی ہے لیکن یہ کیفیت وقتی ہے، عارضی ہے اس میں قلب ماہیت کی قوت نہیں امراؤ جان کی زندگی
پھر ایک نرم سیر دریا کی طرح بہتی چلی جاتی ہے اس میں نہ کوئی انقلاب آتا ہے، نہ اسے کوئی نئی منزل دکھائی
دیتی ہے نہ وہ اپنے آپ سے فرار کرتی ہے نہ اس کے دماغ کا آہن پگھل کر آئینہ بنتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ
واقعہ نہ کسی راز کا انکشاف کرتا ہے نہ ان واقعات کو ان حدود تک پہنچاتا ہے جہاں وہ خود بہ خود حل
ہوتے ہوئے نظر آئیں نہ وہ کہانی میں، یا امراؤ جان کی زندگی میں کوئی زبردست یا معمولی تبدیلی پیدا
کرتا ہے نہ اس کے بعد کہانی ختم ہوتی ہے نہ اس کا ختم ہونا یا ختم کرنا ناگزیر معلوم ہوتا ہے اس لیے یہ واقعہ
کہانی کا یا امراؤ جان کی زندگی کا نقطۂ عروج نہیں ہے اگر یہ واقعہ کہانی کا نقطۂ عروج ہوتا تو یہ
کہانی امراؤ جان کی کہانی ہوتی اور اگر یہ امراؤ جان کی محدود واقعاتی زندگی کا نقطۂ عروج ہوتا
تو اس کی زندگی ختم ہو جاتی خودکشی اور خانقاہ کے علاوہ بھی کچھ مقامات ہیں اور ہمیں امراؤ جان
ان مقامات پر کہیں نہیں دکھائی دیتی زندگی کا دھارا کس رفتار سے اور کن صحراؤں اور وادیوں سے
گزرتا اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں وقت کی خوبی یہی ہے کہ گزر جاتا ہے اس مسئلہ پر اس قدر تفصیل
کی ضرورت نہ ہوتی اگر بعض ناقدوں نے اس ناول کو امراؤ جان کی کہانی سے تعبیر نہ کیا ہوتا مثال کے طور
پر علی عباس حسینی اپنی کتاب "ناول کی تاریخ و تنقید" میں لکھتے ہیں "یہ ایک رنڈی کی کہانی اسی کی زبانی ہے۔"

اتنی باتیں کہہ چکنے اور اتنا راستہ طے کر جانے کے باوجود ہم تقریباً وہیں ہیں جہاں سے چلے تھے آخر اس ناول کا موضوع کیا ہے؟ امراؤ جان نہیں، ہرگز نہیں۔ ممکن ہے اس کا موضوع طوائفوں کی زندگی ہو۔ علی عباس نے اس کا ذکر کرتے ہوئے مرحوم (یا مادی پٹ) کو یاد کرتے ہیں اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ خانم، بوا حسینی، خورشید اور بسم اللہ ہیں بھولتی نہیں۔ رسوا نے یہ فانوس روشن کئے ہیں۔ ان کے رنگ مختلف ہیں ان کی روشنی بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے یہ فانوس اپنی اپنی قدر و قیمت بھی رکھتے ہیں۔ لیکن کیا یہ چھوٹے موٹے جہاں ہیں جو خانم کے آسمان تلے گردش کرتے ہیں اور ہم کچھ ان کے ارد گرد دیکھتے ہیں وہ انہی کے دم سے انہی کو اجاگر کرنے کے لیے انہی کی گردش تیز کرنے اور انہی کو فروغ دینے کے لیے وجود میں لایا گیا ہے؟ دوسرے یہ کہ ان کی زندگیاں بھرپور اور مکمل ہیں کیا مولوی صاحب اس کہانی میں اس لیے تماشہ کرتے ہیں کہ وہ بسم اللہ جان اور امراؤ جان کی زندگی کو آگے بڑھائیں اور ان کی سیرتوں کو روشن اور منور کریں۔ کیا راشد اس میدان میں اس لیے آتے ہیں کہ وہ امراؤ جان کی دکان لگانے میں مدد کریں اور چلے جائیں۔

فیضو ستارے کی طرح ٹوٹتے دم بھر چمکتے اپنی قوت کا احساس دلاتے اور غائب ہو جاتے ہیں محض اس لیے کہ وہ امراؤ جان کو لکھنؤ کی گلیوں سے نکال کر کان پور کے ویران کوچوں میں پھینک دیں؟ نواب سلطان" جن کے لیے ہوئے تھے "محلے کا جلسہ آپس میں چہلیں، بے تکلفی کی باتیں" امراؤ جان کو تڑپاتی ہیں نواب چھبن جن کی آنکھیں اس وقت کھلتی ہیں جب خانم کہتی ہیں" حضور کو معلوم نہیں کہ بیسوائیں چار پیسے کی میت ہوتی ہیں کیا آپ نے یہ مثل نہیں سنی کہ رنڈی کس کی جورو، لوگ مروت کریں تو کھائیں کیا۔ یوں آئیے آپ کا گھر ہے۔ میں منع نہیں کرتی مگر آپ کو اپنی عزت کا آپ خیال چاہیئے" اور ہاں وہ نواب جن کا نام بھول سکتا ہے مگر سیرت نہیں بھولتی نواب جعفر علی خاں سن شریف کوئی ستر برس کے قریب بوڑھے ہو گئے تھے مگر کیا مجال نو بجے کے بعد دیوان خانے میں بیٹھ سکیں اگر کسی دن اتفاق سے دیر ہو گئی بھولی آ کے زبردستی اٹھا لے جاتی تھی" کیا یہ محض گاہک ہیں؟ ان کا کام یہ ہے کہ خانم کی نوچیوں کو گلستان سعدی کا باب پنجم پڑھائیں اور بس! پھر یہ طویل مشاعرہ کیوں؟

عیش باغ کے میلے کی ہماہمی ان طوائفوں کی بدولت ہے اور نہ ان کی زندگی کے کسی خاص پہلو کو نمایاں
کرتی ہے ڈاکوؤں کے جرگے صرف سنسنی پیدا کرنے کے لیے نہیں ہیں پھر وہ مولوی صاحب جو نیم کے درخت پر
چڑھائے جاتے ہیں اتنی سی بات پر کہ انھوں نے دھنو (بسم اللہ جان کی بندریا) کو لاٹھی دکھا کر ڈرا دیا
تھا۔ وہی جن سے بسم اللہ کہتی ہیں "چڑھ جاؤ" مولوی صاحب بسم اللہ کہہ کے اٹھے عبا شریف کو ٹخنوں
کے چوکے پر چھوڑا نیم کی جڑ کے پاس کھڑے ہوئے پھر ایک مرتبہ بسم اللہ کی طرف دیکھا اس نے اک ذرا
جبیں بہ جبیں ہو کر کہا۔ ہوں۔ آخر درخت کی پھننگ کے پاس پہنچ گئے اور وہ نوجوان مولوی جو کانپور
کی مسجد میں رہتے ہیں امراؤ جان سے پارسائی جتاتے ہیں جن کے منہ پر جونن پن سا ہے مگر آدمی کام
کے ہیں ہر بات پر لاحول پڑھتے ہیں اور پوچھتے ہیں "آپ کا مطلب" شاید ان کے جی میں شیطان ہے
مگر وہ بڑی بی "گوری سی، منہ پر جھریاں پڑی ہوئی ہاتھوں میں چاندی کے موٹے موٹے کڑے
انگلیوں میں انگوٹھیاں، جریب ہاتھ میں۔ ہانپتی کانپتی ہوئی بیٹھ گئیں پان منگا کے کھایا بولیں" ہمارے
ہمارے شہر کی تمیزداری" ان کے علاوہ لڈن کی ماں جو دنیا بھر کو اپنی سوت سمجھتی ہیں کسی کی دبیل
نہیں جن کا انداز یہ ہے، دیکھیں تو تم ہمارا کیا بناتی ہو" "منہ بنواؤ جوتیاں ماریں گی بڑی بچاری
امراؤ جان سے ارشاد کرتی ہیں" مجھ سے تو کچھ نہ بولنا مال زادی تجھے تو کچا ہی کھا جاویں گی" پھر لہنگا
جھاڑ جھوڑ بڑبڑاتی ہوئی چلی جاتی ہیں پھر حسین علی اور اس کی جورو منے اور اس کی ماں پٹھانی
کٹنی، جو بڑے مشہوروں میں تھی پھر میاں سعادت جن کی" والدہ کو مرغیوں سے شوق تھا" مکان
کے پاس ایک تکیہ تھا وہاں مرغیاں چرا کرتی تھیں" پھر رجب کی نوچندی اور درگاہ کی زیارت غرض یہ
نواب، مولوی، ڈاکو اور کتیا ل، مختار اور بیگمیں، مشاعرے اور میلے، مکھیاں بھنکتے ہوئے گھر اور مریدوں
سے آباد تکیے دکانیں سرائے اور محلات مشاعر اور ان کے شاگرد، فقیر فقرا اور ضعیف الاعتقادی کے
کرشمے یہ سب خود طوائفوں کی سیرت بنانے، بگاڑنے ابھارنے اور مٹانے کے لیے وجود میں نہیں آتے
ان کا اپنا مقصد اپنا مصرف اور اپنی میزان ہے انھیں ہم طوائفوں کی قدر و قیمت کے پیمانہ سے نہیں
جانچتے، وہ خود اپنی قدر و قیمت رکھتے ہیں امراؤ جان یا کوئی اور طوائف ان کرداروں اور ان خاندانوں

پر غالب نہیں آتی البتہ ان سب کو ہم ایک تجربہ کار طوائف کی آنکھ سے دیکھتے ہیں اور کبھی کبھی خود وہ طوائف پس منظر میں غائب ہو جاتی ہے اور ہمارے سامنے ایک ڈرامائی ٹکراؤ آتا ہے جہاں کسی کردار کا ذہن بے نقاب ہوتا ہے کہ دو یا دو سے زیادہ ذہن متصادم ہوتے ہیں یا پلاٹ میں کسی غیر متوقع واقعے سے سنسنی پیدا کی جاتی ہے ناول ایک بار پڑھنے کے بعد ہمیں خورشید، بسم اللہ جان، خانم اور بوا حسینی یاد رہتی ہیں لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ رسوا نے ان خاکوں میں زندگی کا رنگ بھر دیا ہے ان کا دائرۂ عمل بہت محدود ہے یہ ایک حد تک اپنے لیے مگر بڑی حد تک دوسروں کے لیے زندہ ہیں ان کی افادیت اور زندگی اس پر موقوف ہے کہ یہ ایک وسیع منظر کا تعارف میں اور اسے ہمارے سامنے لا کر یا اس کے چند نقش و نگار دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں ان میں سے ہر ایک وقتی پر اپنا اثر چھوڑ جاتا ہے مگر ان کے شعور کی لہریں سعی و عمل میں اپنا بھرپور اظہار نہیں کرتیں ان میں سے ایک کردار بھی "یا" "ادی پٹ" کی جینی سے لگا نہیں کھاتا ان کی زندگی کے واقعات ایک دوسرے کی زندگی کے واقعات سے گتھے ہوئے نہیں ہیں ورنہ ان کو ٹیک دیتے ہیں ان کی ذہنی کشمکش جذباتی ہیجان، کمزوریاں اور اچھائیاں، دوسروں پر اس طرح اثر انداز نہیں ہوتیں کہ ناول کا پلاٹ ان کی رمیدگی اور خرام کی ایک مسلسل رو میں تبدیل ہو جائے ناول کی زندگی اس صندوق میں بند نہیں ہے جس کے چاند تارے خورشید اور بسم اللہ ہوں اور باقی کردار ان چاند تاروں کے اشاروں اور سہاروں سے منظر عام پر آئیں اور چلے جائیں دوسرے یہ کہ ان طوائفوں میں اور ان کے علاوہ جو کردار ہیں ان میں سے ہر ایک دو حیثیتیں رکھتا ہے یہ رسوا کا کمال ہے کہ اس نے اپنے قلم کی چند جنبشوں سے انھیں مسلم شخصیت بنا دیا ہے ان میں سے ہر ایک اک فرد بھی ہے اور اک جماعت کا نمائندہ بھی ہے وہ ایک ذات بھی ہے اور جماعت کے کسی خاص پہلو کو آب و تاب کے ساتھ پیش بھی کرتا ہے وہ ایک شخص بھی ہے اور ایک وسیلہ بھی نواب سلطان ایک خاص پہلو کی نمائندگی کرتے ہیں ان میں توازن ہے نواب چھبن ایک دوسرے پہلو کی ان میں جرأت ہے۔ راشد ایک اور جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جو مصنوعی پندار میں مبتلا ہے فیض علی اپنے گروہ کا نمائندہ ہے جس کی قوتیں مناسب راہ نہیں پاتیں، مختار کے ذریعہ ہم ادنیٰ متوسط درجے کا تماشہ کرتے ہیں جو تقدیر پرست ہے بی آبادی کے ذریعہ سے ہماری رسائی تقدیروں اور مرغیاں نکالنے

والیوں تک ہوتی ہے جن کا اخلاق فوری ضرورتوں کا پابند ہے۔ کان پور کے مولوی صاحب ہیں ایک خاص طبقہ تک پہنچاتے ہیں جن کے بارے میں حالی نے کہا ہے "وہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت" ہم ان میں سے جس کسی کو دیکھتے ہیں ناول کی دنیا میں دیکھتے ہیں اور ناول کی فضا میں یہ کردار ایک خاص زاویہ نظر کو چھپائے ہوئے آتے ہیں وہ زاویۂ نظر فن کی باریکیوں میں ڈوبے سے ہاتھ آتا ہے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں کردار مضحک سا ہے یا اچھا یا برا ہے تو دراصل ہم اس زاویۂ نظر کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو ان واقعات کی ترتیب میں چھپا ہوا ہے جن کی بدولت وہ کردار کے ذہن سے کاغذی پیرہن میں منتقل ہوئے ہیں بہر حال امراؤ جان کے تقریباً سبھی کردار دو حیثیت رکھتے ہیں ہم ان میں سے جس کسی کو دیکھتے ہیں وہ پکار اٹھتا ہے "میں زندہ ہوں میں اپنی زندگی کا ثبوت بھی دے چکا ہوں یہ زندگی میری زندگی ہے یہ خود بڑھتی اور پھیلتی ہے لیکن میں ایک استعارہ بھی ہوں میں اس مخلوق کی طرف اشارہ کرتا ہوں جو میرے ارد گرد بکھری ہوئی ہے وہ میری طرح پندار میں گرفتار ہے مظلوم ہے فریب خوردہ ہے آلودگی یا آسودگی میں مبتلا ہے کمزور ہے طاقت ہے مگر آپ اپنا شکار ہے وہ محروم ہے مگر اپنی محرومیوں کو مژدہ بنا کر پیش کرتی ہے وہ بظاہر کتنی بلند ہے لیکن اس کی تہ میں کچھ بھی نہیں وہ ضرب لگاتی ہے مگر خواب و خیال میں وہ شکست کھاتی ہے مگر تلملاتی نہیں وہ ہنستی بھی ہے اور روتی بھی ہے مگر اس کے ہنسنے میں مارگی ہے نہ رونے میں پیاس"۔

مختصر یہ کہ بیشتر کردار ایک وسیلہ ہیں جن کی مدد سے ہم چند طبقوں کو دیکھتے ہیں مگر ان طبقوں کی زندگی تو درکنار ان کرداروں کی زندگی بھی طوائفوں پر موقوف نہیں اور نہ بڑی حد تک ان کی معاون ہے ان میں سے ہر ایک طوائف کی کہانی چند جملوں میں سنائی جاسکتی ہے اور یہ کہانی دوسری طوائف کی کہانی سے بالکل آزاد ہوگی۔ ان سب کی مجموعی داستان بھی اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ یہ سب طوائفیں تھیں ناول نگار کی تمام صلاحیتیں بھی ان کی مصوری پر صرف نہیں ہوتیں اور ناول کا سارا مواد بھی ان کی نواؤں اور فضاؤں میں حل نہیں ہوتا میلے، مشاعرے، مجرے ہم یقیناً ایک طوائف کی آنکھ سے دیکھتے ہیں لیکن یہ آنکھ ہمیں بہت دور لے جاتی ہے۔ ان جلسوں میں ہمیں منچلے عاشق اور پیشہ ور عیاش ہی نہیں ان کے علاوہ کچھ اور بھی دکھائی دیتا ہے اور اس کی تہ میں کوئی ایسی

چلا نظر آتی ہے جس سے مختلف آوازوں میں زیر و بم اور مختلف اجزا میں معنوی ربط اور تسلسل اور آہنگ پیدا ہوتا ہے اس لیے یہ کہنا غلط ہیں کہ طوائفوں کی زندگی اس ناول کا موضوع نہیں ہے اب ہم اپنے منطقی نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں لیکن آپ کی اجازت سے غلط بحث ہی کی خاطر سہی میں ایک اور گریز کرنا چاہتا ہوں کہیں اس ناول کا موضوع یہ تو نہیں کہ چند آدمی اپنی زندگی کس طرح بسر کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں چند اشارے کافی ہیں ہم اگر چند انسانوں کو زندگی بسر کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں انھیں اول سے آخر تک دیکھنا ہوگا ہم انھیں جم کر اور استقلال کے ساتھ دیکھیں گے ان کا ماحول محدود ہونا چاہیے اور انھیں اپنے ماحول میں اس طرح پیوست ہونا چاہیے کہ ہزار کوشش کے باوجود ہم انھیں اس زمین سے دور نہ کر سکیں جس میں وہ گل و لالہ کی طرح پھوٹے ہیں ہمیں اس ماحول کی تفصیل اور ان انسانوں کی تقدیر کی جزئیات سے واقف ہونا پڑے گا ان کے ایک ایک عمل کا مشاہدہ اس طرح کرنا ہوگا جیسے ہم ان کو تحلیل کر رہے ہیں ان کی کہانیوں میں گہرا ربط ہوگا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ان سب کی کہانی ایک ہوگی اور وہ کہانی ایک ایسا کل ہوگی جس کا ہر جزو دوسرے جزو سے دست و گریباں ہو یہی نہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک اس وقت تک ہماری نظروں سے اوجھل نہ ہوگا جب تک وہ اپنی تقدیر کے آخری سرے پر نہ پہنچ جائے اور جب تک ہم یہ نہ کہہ سکیں کہ اس کی زندگی کا دائرہ پورا ہو گیا ایسے ناول کے ہر کردار کو مادام باوری کے چارلس کی طرح اس وقت تک زندہ رہنا پڑے گا جب تک وہ اپنی زندگی کے معنی نہ سمجھ لے جب تک وہ اس راز کو نہ پا جائے کہ جس عورت کو اس نے اپنی زندگی کے بہترین راز سپرد کئے ہیں وہ میری نہیں دوسروں کی راز دار تھی جب تک اس پر یہ انکشاف نہ ہو جائے کہ دنیا میں معمولی سے معمولی بات ایک ایسا انکشاف ہے جس کی قیمت انسان اپنی جان گنوا کر ہی ادا کر سکتا ہے اسے اپنی خبر مل جانی چاہیے اور وہ نظر بھی جو خبر کو پا لیتی ہے اور جو آگہی کے باوجود محروم ہوتی ہے کس قدر ناکارہ ہوں میں کہ میری ساری عمر ایک عورت کی ذہنی تصویر میں رنگ بھرتے گذر گئی اور جب وہ تصویر ٹوٹ گئی تو پتہ چلا کہ وہ خود ساری عمر دوسری تصویروں میں رنگ بھرتی رہی" یہاں پہنچ کر اس ناول کو ختم ہو جانا چاہیے۔ یہ مادام باوری، چارلس اور ناول تینوں کا فطری انجام ہے اور ہم مطمئن ہیں کہ ہم نے

ان سب کو پامال ہوتے ہوئے دیکھ لیا، امراؤ جان اس قسم کا ناول نہیں ہے وہ نہ امراؤ جان کی کہانی ہے نہ طوائفوں کی روداد ہے نہ اس میں چند انسانوں کی شکست و کامرانی ہے جو دھیرے دھیرے عدم سے ابھرتی ہوئی نظر آئے اور ہمیں بار بار یقین دلائے "میں ایک تصویر ہوں۔ میں سچی ہوں ذرا میرا آب و رنگ تو دیکھو"۔

امراؤ جان کا موضوع زوال ہے یہ زوال ایک خاص معاشرت کا ہے اور وہ معاشرت لودھ کے چند شہروں تک محدود ہے رسوا اس معاشرت کی تصویر دکھانا چاہتے تھے ان کے ذہن میں اس کا ایک تصور بھی تھا۔ ان کے چاروں طرف اس کا مواد بکھرا ہوا تھا اور یہ مواد آسانی سے گرفت میں لانا محال تھا ان میں اتنی قوت بھی تھی کہ اسے براہ راست استعمال کر سکیں اور جہاں سے چاہیں بنتے چلے جائیں۔ سرشار تو ایک دیو زاد تھا اتنے وسیع پیمانے پر کام کرنا رسوا کے بس کی بات نہ تھی ان میں یہ حوصلہ بھی نہ تھا کہ وہ ناممکن کو ممکن اور ممکن کو قطعی ثابت کر دکھائیں وہ ہر سچے فن کار کی طرح شرمیلے تھے اور انھیں یہ گوارا نہ تھا کہ وہ ہر دقیقہ کے بعد پکار کر کہیں "تمہیں مجھ پر یقین کرنا چاہیے میں تمہیں جو کچھ دکھا رہا ہوں وہ ایسا ہی ہے میں سب کچھ جانتا منزل تک پہنچنے میں کئی دشواریاں تھیں تصویر مختصر پلان پر بنائی جائے ادھوری نہ ہو فن کار کی شخصیت نظروں سے اوجھل رہے۔ ہر پہلو اپنی قدر و قیمت کے اعتبار سے جگہ پائے کوئی ایسا منظر ہو جہاں سے زندگی کا ہر گوشہ نظر آئے اور اس منظر کی بدولت ان سب کا مفہوم واضح ہو جائے ان شرائط کے ساتھ زوال پذیر معاشرت کا مطالعہ کرنے کے لیے خانم کے نگار خانے سے بہتر کوئی اور منظر نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا خانقاہ میں یہ پہلو نظر نہ آتے نوابین کے ایوانوں اور شبستانوں میں چند جھلکیاں دکھائی دے جاتیں مگر تصویر نا تمام رہتی فیض آباد کے کسی محلہ میں نوابین اور بیگمات کا گذر نہ ہوتا نہ عیش باغ کے میلے اور لکھنؤ کے مشاعروں کی ہما ہمی دکھائی دیتی اس لیے رسوا نے خانم کی دکان تلاش کی اس دکان میں ہر شے کا سامان تھا اور اس کے گاہک اس معاشرت میں دور و نزدیک پھیلے ہوئے تھے یہ گاہک ہر درجہ کے لوگ تھے ان کے اخلاقی معیار خاصے مختلف تھے ان میں فنونِ لطیفہ سے دلچسپی رکھنے والے بھی تھے اور دوسرے بھی مگر ان سب میں ایک بات مشترک تھی اور وہ یہ کہ ان میں سے ہر ایک قہوہ پی پی کر زندگی کا ثبوت دیتا تھا رفتہ رفتہ قہوہ زندگی کا مفہوم اختیار کر گیا اور زندگی کا اپنا کوئی مفہوم باقی نہ رہا پھر حال یہ تصور

اں سے رسوا اس خرابہ کا نظارہ کر سکتے تھے اب یہ سوال تھا کہ رسوا ان نظاروں کو خود دکھائیں یا کسی اور کو
جو دمیں لائیں جو ان نظاروں کا مفہوم آہستہ آہستہ پائے اور جوں جوں پاتا جائے دکھاتا چلا جائے خانم اس
ن کو انجام نہ دے سکتی تھی وہ جہاں دیدہ ضرور تھی مگر انھوں نے محض ایک جہان دیکھا تھا وہی ان کے لیے سب
ہ تھا ان کی نظر اس کے جادو کا شکار تھی اور ان کے اغراض اس کی بساط کا پیوند تھے ان میں بے لوثی رہتی اور وہ
یروں کو اپنے اصلی روپ میں دیکھنے کی صلاحیت سے محروم تھیں

لہذا رسوا نے ایک ایسے کردار کی تخلیق کی جو خانم کی محرومیوں سے پاک ہو یہ کردار امراؤ جان ہو امراؤ جان نے
نم کے نگار خانے میں آنکھیں نہیں کھولیں نہ وہ پیدائشی طوائف ہو اور نہ ریاست و امارت کی زخم خوردہ اس کے پاس
، اخلاقی پیمانے بھی نہیں جن سے ہر چیز کو ناپ تول سکیں وہ محض ایک انسان ہو جس کا بہترین جوہر سلامت رہا
اس کردار کی تخلیق میں رسوا کی فنی بصیرت پوری طرح نمایاں ہو امراؤ جان اس ماحول میں اس طور سے لائی
ی ہو کہ ہمیں اس سے فوراً ہمدردی پیدا ہو جاتی ہو وہ اس ماحول کو اسی نظر سے دیکھتی ہو جس نظر سے ہم دیکھتے
دیکھنے پر مجبور ہوتے ہیں یہ ماحول ہمارے لیے قطعاً اجنبی ہو۔

وہ کوئی بندھا ٹکا اخلاقی معیار نہیں رکھتی اور اسی لیے اس کی نظر ہر گوشہ پر پڑتی ہو وہ ہر مزاج کے
ری کو اپنا ساتھ دینے پر آمادہ کر لیتی ہو۔

ہم جانتے ہیں کہ وہ زندگی کی خاصی واقفیت رکھتی ہو اسی لیے اس کا ہر فیصلہ ہمارے لیے قابل قبول ہو جاتا ہو
اس میں انسانی ہمدردی ہو اس ہمدردی سے ایک خاص زاویہ نظر پیدا ہوتا ہو اور وہ زاویہ نظر کردار کو
ایک خاص روشنی میں پیش کرتا ہو اور اس سے رمزیہ طنز پیدا ہوتا ہو

اب ہمارا روحانی سفر شروع ہوتا ہو "جا کے جو دیکھا معلوم ہوا، آہا، امراؤ جان صاحب تشریف
تی ہیں"

مراؤ جان۔ (دیکھتے ہی)، "اللہ مرزا صاحب آپ تو ہمیں بھول ہی گئے"
ں۔ "یہ معلوم کس کو تھا کہ آپ کس کوہ قاف میں تشریف رکھتی ہیں"
مراؤ جان۔ "..... آج آپ کی غزل نے بے چین کر دیا.. ہاں وہ شعر ذرا پھر پڑھ دیجئے"

میں "اگر آپ کو شوق ہو تو وہیں تشریف لے چلیے۔"

تھوڑی دیر کے بعد امراؤ جان صاحبہ کنگھی چوٹی کرکے کپڑے بدل کے آئیں ... بڑے لطف کا جلسہ ہوا۔ امراؤ جان اکثر شام کو چلی آتی تھیں ..."

یہ گویا تعارف کی ابتدا ہی ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم امراؤ جان کو ایک مدت سے جانتے ہیں۔ وہ ہمارے لیے اجنبی نہیں وہ بہت سادہ اور بے تکلف ہیں اور ہماری محفل میں ان کا گاہے گاہے چلا آنا لطف سے خالی نہیں وہ خاصی دلچسپ ہیں اور ان کی زندگی میں کچھ ایسے لطائف بھی ہیں جنھیں پاکر ہمیں خوشی ہوگی مگر اس سے پہلے کہ ہم ابھی روح ان کے حوالے کریں ذرا اس محفل کے خدوخال بھی دیکھتے چلیں جس میں وہ لائی گئی ہیں یہ محفل بے تکلف دوستوں کی ہے یہ لوگ دن کی دھوپ میں کیا کرتے ہیں اور کیا سوچتے ہیں اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ان میں سے ہر ایک کو شعر و سخن کا ذوق ہے ان میں ہر قسم کے شاعر ہیں یہ فلسفہ بھی کہتے ہیں اور مذاق بھی کرتے ہیں لیکن ان سب میں روحانیت کا فقدان ہے یہ اتنے کمزور ہیں کہ بندش کی چستی پر زور دیتے ہیں ان سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی اور اسی لیے یہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں کر سکتے ہر ہر بات پر بزرگوں کی سند لاتے ہیں مگر خود مستند نہیں ہیں یہ طوفان کے خواب دیکھتے ہیں طوفان برپا نہیں کر سکتے ان میں مجتہدین کے قابل سب ہیں اجتہاد کا کوئی قابل نہیں پردوں کے رنگ سب دیکھتے ہیں پردہ چاک کرنے کا حوصلہ کسی میں نہیں ان میں کاریگر بھی ہیں اور تاجر بھی ہیں یہ پہیلیاں بوجھتے ہیں، محاورے باندھتے ہیں گرہ لگاتے ہیں، گرکیوں؟

کوئی پوچھے تو مرنے والے آخر کس پہ مرتے ہیں

مگر پوچھے کون؟" آخر مظہر الحق نامی ایک شاعر کہیں باہر کے رہنے والے جو اس وقت اتفاق سے وارد مشاعرہ تھے یہ غلطی کر بیٹھتے ہیں روشِ اہل فن پہ ہنستے ہیں، رنگ بزم سخن پہ ہنستے ہیں رسوا ان نو وارد کی مدد سے گریز کرتے ہیں اس نئے احساس کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو نئی نسل میں پیدا ہو چلا تھا اور ساتھ ہی ہمارے تصور میں ایک خاص قسم کی نازکی پیدا کر دیتے ہیں، یہ مشاعرہ خاصہ طویل ہے یہ نقص اس کی تاثیر میں خلل انداز ہوتا ہے مگر ہم یہ کہ اس کی اہمیت کو کم نہیں کر سکتے اس مشاعرہ کے لیے بڑا اہتمام کیا گیا ہے اور ہمیں اس کی داد دینا پڑے گی کہ ہمیں اس معاشرت کی پہلی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں اور ہمیں اس کے ساز و سامان کو دیکھ کر بڑی حسرت ہوتی ہے۔

کہنا پڑتا ہے" اس چلمن کے پیچھے کوئی بیٹھ [illegible] کے دن تھے مہتابی پر دو گھڑی دن رہے چھڑکاؤ ہوا تھا تاکہ تمام
چمک زمین سرد ہو جائے اس پر [illegible] کر [illegible] چاندنی کا فرش کر دیا گیا تھا کوری کوری صراحیاں پانی بھر کے کیوڑا
ڈال کے منڈیر [illegible] ڈھکے ہوئے تھے برف کا انتظام علیحدہ کیا گیا تھا کاغذی
[illegible] صافی میں لپیٹ کر کیوڑے میں بسا کر رکھ دی گئی تھیں،
ڈھکیوں [illegible] دیا تھا ڈیڑھ خمے حقوں کے نیچوں میں پانی چھڑک چھڑک کر
[illegible] انتظام زیادہ نہیں کرنا پڑا صرف ایک سفید کنول دورے کے
[illegible] دیا تھا، اصلی چاندنی [illegible] کے آب [illegible] سفید کنول یہ سب چیزیں کیسی سوگوار معلوم ہوتی ہیں تو رہا
کی ہو گی میں [illegible] یہ [illegible] نہ ہو گی اس نظارہ میں درد و گداز ہے اس محفل کے ظاہری حسن پر ہم جتنی دیر نگاہ جمائے
رکھتے ہیں [illegible] اس کی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے مشاعرہ ختم ہونے سے پہلے آغا صاحب کا ایک شعر
اور اس کی تعریف سنتے چلیے تو ممکن ہے کچھ انشراح صدر ہو جائے

تری نازک کمر کے اب ہیں چہلک بنا دیں گے [illegible] گیا سمجھے یہ بار یک طبعیت جس کی گتھل ہو

خاں صاحب۔ "برائے خدا اس چہلک کے معنی سمجھا دیجیے۔"

آغا صاحب۔ "خیر خاطر ہے سن لیجیے محاسبے لوگ خانہ پری کے بجائے ندارد کے یہ نشان (××) بنا دیا کرتے ہیں اس لیے اس سے یہ مطلب نکلا کہ کمر معدوم ہے دوسرے ایک خطانے بیچوں بیچ سے دوسرے کو کاٹ دیا ہے اس سے یہ ظاہر ہوا کہ معشوق کی کمر کٹی ہوئی ہے اور پھر جڑی ہوتی بھی ہے۔"

خاں صاحب۔ "یہ کیوں کر؟"

آغا صاحب۔ "اس باریکی کو نہ پوچھیے خیر حضرت واضح ہو کہ چہلک علم ریاضی میں علامت جمع کی ہے لطف یہ ہے کہ علامت کی کوئی مقدار نہیں ہوتی مطلب یہ نکلا کہ کمر باوجود معدوم ہونے کے جسم کے دونوں حصوں کو جوڑے ہوئے ہے۔ لطف یہ ہے کہ علامت کی کوئی مقدار نہیں ہوتی" اس معاشرت پر اس سے بہتر اور کیا طنز ہو سکتا ہے علامت کی کوئی مقدار نہیں ہوتی آئیے اس پہیلی کو بوجھیں شاید اس پہیلی کو بوجھنے میں امراؤ جان ہمارے کام آ سکیں!

یہ تو ہم دیکھ آئے ہیں کہ وہ خانم کی دکان میں پہنچ گئی ہیں یہ دکان کیسی ہے یہاں کون لوگ آتے ہیں کون رہتے ہیں اس کی زد میں زمانہ کی کتنی گردشیں ہیں یہ تماشا مختلف صورتوں میں ظاہر ہوگا کہیں محض تصویر کے ذریعہ سے جس پر رسوا کو پوری قدرت ہے کہیں ڈرامہ کی صورت میں جو کہیں کہیں شورش انگیز ہو جاتا ہے اور کہیں خواب اور مشاہدہ نفس کے انداز میں جس کی قدر و قیمت اور رعنائی کا اندازہ ان خاص مقامات پر ہوتا ہے جہاں گزرے ہوئے زمانہ کی تلخیص کی گئی ہے اور جہاں کردار نے حیات و کیفیات میں نوک خار کی سی تیزی دکھانا شروع کی۔

یوں تو کردار یہاں سے ابھرتے ہیں اور یہاں کرداروں سے نبتا ہے یعنی یہ سب کچھ لہروں کا کھیل ہے مگر ان لہروں کا ساتھ دینا مشکل ہے اور ہمیں مجبوراً ٹھہر کر دیکھنا ہوگا آئیے اب ذرا خانم کی تصویر، نوچیوں کے مرتبے اور خانم کے نگار خانے کی آن بان دیکھتے چلیں 'خانم کا سن قریب پچاس برس کے تھا کیا شاندار بڑھیا تھی رنگ تو سانولا تھا مگر ایسی بھاری بھرکم جامہ زیب عورت دیکھی نہ سنی' بالوں کے آگے کی پٹیں بالکل سفید تھیں ان کے چہرے پر بھلی معلوم ہوتی تھیں ململ کا دوپٹہ سفید کیا بار یک چنا ہوا کہ شاید و باید اودے مشروع کا پاجامہ بڑے بڑے پائنچے' ہاتھوں میں موٹے موٹے سونے کے کڑے، کلائیوں میں پھنسے ہوئے۔ کانوں میں سادی دو بالیاں لاکھ لاکھ بناؤ دیتی تھیں ... پلنگڑی سے لگی ہوئی قالین پر بیٹھی ہیں کنول روشن ہے سامنے ایک سانولی سی لڑکی (بسم اللہ جان) ناچ رہی ہے'

اس کردار میں قوت کا احساس ہوتا ہے دیکھیں کاروبار میں خانم کے تور کیا ہوتے ہیں،

خانم جان "یہی چھوکری ہے" (مراد امراؤ جان سے ہے)

دلاور خاں "جی ہاں"

خانم جان نے مجھے پاس بلایا چمکار کے بٹھایا، ہاتھ اٹھا کے صورت دیکھی

خانم جان "اچھا پھر جو ہم نے کہہ دیا ہے موجود ہے اور وہ دوسری چھوکری کیا ہوئی؟"

پیر بخش۔ "اس کا تو معاملہ ہو گیا"

خانم۔ "کتنے پر؟"

پیر بخش۔ "دو سو پر"

خانم جان۔ "صورت شکل کی اچھی ہے اتنے ہم بھی دے سکتے لیکن تم نے جلدی کی"

دلاور خاں۔ "صورت تو اس کی بھی اچھی ہے آگے آپ کی پسند"

خانم ۔ "خیر آدمی کا بچہ ہے"

دلاور خاں۔ "اچھا جو کچھ ہے آپ کے سامنے موجود ہے"

خانم "اچھا تمہاری ہی ضد سہی" (یہ کہہ کے حسینی کو آواز دی)

حسینی گدبدی سے سانولی ادھیڑ عمر کی عورت سامنے آ کھڑی ہوئی۔

خانم "حسینی!"

حسینی "خانم صاحب"

خانم "صندوقچہ لاؤ"

حسینی گئی صندوقچہ لے آئی خانم صاحب نے صندوقچہ کھولا روپے دلاور خاں کے سامنے رکھ دئے

سودا چکا دیا گیا اب خانم کے سوچنے کا انداز اور بوا حسینی کا کردار دیکھئے۔

خانم (بوا حسینی سے) "حسینی، یہ چھوکری اتنے داموں مہنگی تو نہیں معلوم ہوتی"

حسینی "مہنگی! میں کہتی ہوں سستی"

خانم ۔ "خیر ہوگا۔ صورت تو بھولی بھالی ہے خدا جانے کس کی لڑکی ہے۔ ہائے ماں باپ کا کیا حال ہوا

ہوگا خدا جانے کہاں سے موئے پکڑ لاتے ہیں ذرا بھی خوف خدا نہیں"

بوا حسینی "ہم لوگ بالکل بے قصور ہیں عذاب تو انہی موؤں کی گردن پر ہوتا ہے ہم سے کیا یہاں نہ بکتی کہیں اور بکتی"

حسینی ۔ "خانم صاحب یہاں پھر اچھی رہے گی آپ نے سنا نہیں بیویوں میں لونڈیوں کی کیا گتیں ہوتی ہیں"

خانم ۔ "سنا کیوں نہیں ابھی اس دن کا ذکر ہے سنا تھا سلطان جہاں بیگم نے اپنی لونڈی کو کہیں میاں سے بات

کرتے دیکھ لیا تھا سینخوں سے داغ کے مار ڈالا۔

حسینی ۔ دنیا میں جو چاہیں کرلیں قیامت کے دن ایسی بیویوں کا منہ کالا ہوگا"

خانم "منہ کالا ہوگا جہنم کے کندے پڑیں گے" ....

اس کے بعد بوا حسینی نے بڑی منت سے کہا "بیوی یہ چھوکری تو مجھے دے دیجئے میں پالوں گی ، ماں آپ کا ہے خدمت میں کروں گی۔"

خانم "نہیں پالو۔"

اب تک بوا حسینی کھڑی ہوئی تھیں اس گفتگو کے بعد میرے پاس بیٹھ گئیں مجھ سے باتیں کرنے لگیں اس کے بعد بوا حسینی مجھے اپنی کوٹھری میں لے گئیں اچھا اچھا کھانا کھلایا، مٹھائیاں کھلائیں، منھ ہاتھ دھویا اپنے پاس سلا رکھا

اس تصویر میں ہم نے خانم کی شخصیت ان کے سوچنے کا انداز اور کاروبار کا ڈھنگ، بوا حسینی کے معتقدات اور ان کے مزاج کی کیفیت دیکھی۔ خانم میں جمال کم ہے، جلال زیادہ۔ اس کی عقل شناطر ہے وہ اپنے ماحول اور زمانہ کی نبض سے واقف ہیں مگر اس کا درد محسوس نہیں کرتیں اس سے فائدہ اٹھاتی اور اسے پامرکب بناتی ہیں ان میں زبردست قوت ارادی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ ضبط اور توازن بھی ہے وہ دوسروں کی بے کسی سے خوش ہوتی ہیں کیونکہ خود ان میں اس کی بڑی کمی ہے ان کا بہتر نفس بہت جلد مطمئن ہو جاتا ہے وہ کاروبار میں کبھی نہیں چوکتیں وہ چند روایتی باتوں پر اعتقاد رکھتی ہیں مگر اس اعتقاد میں جان نہیں ہے اس سے انھیں اپنے کاروبار میں مدد ملتی ہے وہ چند روایتی باتوں کو دہرا کر اپنے گناہوں کی تلافی کر لیتی ہیں اور اس طرح اپنے نفس اور ان کے تقاضوں میں مفاہمت ہو جاتی ہے بوا حسینی ان کا بہتر نفس ہیں ان کی اپنی کوئی شخصیت نہیں وہ خانم کے سانچہ انھیں کی تابع ہیں وہ خالص عورت ہیں اسی لیے محکوم ہونے میں اور خدمت کرنے میں خوش رہتی ہیں ان میں پرستش کرنے کی امنگ ہے ، وڑنے کی ہمت نہیں مگر یہ پرستش بھی گہرے جذبہ کی ممنون نہیں بلکہ اس قسم کی وضعداری ہے وہ ذہنی اور روحانی طور پر کاہل ہیں اس لیے ایک ہی راستہ پر چلے جاتی ہیں جزا اور سزا پر ایمان رکھتی ہیں مگر اس ایمان کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ اعصاب میں سستی ہوئی تو پان کھا لیا دل میں ابال آیا تو اس پر چھینٹا دے دیا خانم اور بوا حسینی دونوں فریب خوردہ ہیں فرق یہ ہے کہ ایک بوڑھوں کو فریب دے سکتی ہے اور دوسری بچوں کی طرح فریب کھا جاتی ہے۔

اس ماحول کو ہم کس نظر سے دیکھیں رسوا کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ وہ اس ماحول سے لذت حاصل نہیں کرتے نہ وہ محض تأثر پرست ہیں۔ پھر بھی وہ ہمیں ایک زاویۂ نظر دیتے ہیں یہ ٹکڑا ملاحظہ کیجئے جو نظری بھی ہے

اور اس موقعہ پر ناگزیر بھی ہے۔ اس سے دو حالتوں کا مقابلہ مقصود ہے اور اس مقابلہ میں وہ زاویۂ نظر چھپا ہوا ہے جس کی مدد سے ہمیں چیزوں کا مشاہدہ کرنا ہے "آج رات کو میں نے ماں باپ کو خواب میں دیکھا جیسے ابا نوکری پر سے آئے ہیں مٹھائی کا دونا ہاتھ میں ہے چھوٹا بھائی سامنے کھیل رہا ہے اس کو مٹھائی کی ڈلیاں نکال کے دیں مجھے پوچھ رہے ہیں جیسے میں دوسرے دالان میں ہوں اماں باورچی خانہ میں ہیں اتنے میں ابا کو جو دیکھا تو دوڑ کے لپٹ گئی . خواب میں اتنا روئی کہ ہچکیاں بندھ گئیں"۔

خانم اور بوا حسینی پختہ عمر کی عورتیں ہیں اس لیے ان کے کرداروں میں کسی زبردست تبدیلی کا امکان نہیں ان کی اچھائیاں اور برائیاں ہم پر ملتے ہی ظاہر ہوگئیں اب جوں جوں نئے مواقع ہمارے سامنے آتے جائیں گے ان کی خوبیاں اور خامیاں اور اجاگر ہوتی چلی جائیں گی لہذا سردست ہم خانم کی نوچیوں سے دل بہلائیں اور ان کی سرگزشت کا مطالعہ کریں تو زیادہ مفید ہوگا خانم کا مکان بہت وسیع تھا "اس میں بے شمار کمرے تھے ان سب میں رنڈیاں (خانم کی نوچیاں) رہتی تھیں، بسم اللہ (خانم کی لڑکی)، خورشید میری ہم سن تھیں ان کی رنڈیوں میں گنتی نہ تھی ان کے علاوہ دس گیارہ ایسی تھیں جو الگ الگ کمروں میں رہتی تھیں ہر ایک کا عملہ جدا تھا ہر ایک کا دربار علیحدہ ہوتا تھا ایک سے ایک خوبصورت تھی سب گہنے پاتے سے آراستہ ہر وقت بنی ٹھنی نواڑ کے پلنگ ڈوریوں سے کسے ہوئے فرش پر ستھری چاندنی بچھی ہوئی بڑے بڑے نقشی پاندان حسن دان خاصدان اگالدان اپنے اپنے قرینوں سے رکھے ہوئے دیوار پر جلی آئینے عمدہ عمدہ تصویریں چھت میں چھت گیریاں لگی ہوئی جس کے درمیان ایک مختصر سا جھاڑ ادھر ادھر عمدہ ہانڈیاں سر شام سے دو کنول روشن ہو جاتے ہیں دو دو مہریاں دو دو خدمت گار ہاتھ باندھے ہوئے کھڑے ہیں خوبصورت نوجوان رئیس زادے ہر وقت دل بہلانے کو حاضر چاندی کی گڑگڑی منھ سے لگی ہوئی سامنے پاندان کھلا ہوا ہے ایک ایک کو پان لگا کے دیے جاتی ہیں چہلیں ہوتی جاتی ہیں اٹھتی ہیں تو لوگ بسم اللہ کہتے ہیں چلتے ہیں تو لوگ آنکھیں بچھائے دیتے ہیں"

مرزا رسوا بھی ناول نگار کی طرح رسوا اپنی آستین میں روشنی کا ایک سیلاب رکھتے ہیں مگر وہ اسے بہت سلیقہ سے استعمال کرتے ہیں وہ ہر شخص کی قدر اور ہر چیز کی قیمت جانتے ہیں اور ان کی نمود پر محض اتنا وقت اور اتنی شعاعیں صرف کرتے ہیں جو ان کے مقصد کے لیے ضروری ہیں نیز وہ یہ جانتے ہیں کہ شخص کی قدر اور شے کی قیمت متعین کرنے کے لیے ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ انھیں ایک دوسرے سے کیا نسبت ہے یعنی شخص شخص سے اور شے شے سے کیا تعلق رکھتا ہے

اور اسی طرح شے شے سے اور شخص سے کیا ... رکھتی ہے کہاں ایک ہی چیز پر بھرپور روشنی ڈالی جائے کہاں کئی چیزوں پر باری باری اور کہاں تمام چیزوں پر بیک وقت کس زاویہ سے کتنی دیر تک کتنے فاصلہ سے رسوا کے فن میں یہ باتیں اصول کی حیثیت رکھتی ہیں وہ جزئیات پر بہت کم روشنی ڈالتے ہیں اور ان کے انتخاب میں بڑے اختصار سے کام لیتے ہیں عام طور سے وہ اشیاء کی تفصیل اس وقت پیش کرتے ہیں جب انھیں کردار یا زمانہ کی داخلی زندگی کے ایسے گوشوں کو بے نقاب کرنا ہوتا ہے جنھیں کامیابی کے ساتھ اور سہولت سے کسی اور صورت میں سامنے لانا ممکن یا مناسب نہ ہو، بوا حسینی کی کوٹھری میں وہ ہمیں دو چار چیزیں گنا کر روٹھ جاتے ہیں مگر اس انداز سے کہ بوا حسینی کی شخصیت کے ہزار پرتو دفعتاً ہماری نگاہوں میں کوند جاتے ہیں صدر رحبہ یا انا افعاس میں وہ ہمیں ایک وسیع دالان میں لے گئے ہیں جس میں بے شمار کمرے ہیں ان میں خانم کی نوچیاں رہتی ہیں یوں تو خانم اور ان کی نوچیاں اس معاشرت کی انجیل ہیں لیکن اس خاص موقع پر رسوا ہمیں ان سے دو چار نہیں کرتے وہ ان میں سے چند ایک کے نام گنا دیتے ہیں باقی کو جھٹ پٹے میں چھوڑ دیتے ہیں ہمیں ان کی موجودگی کا احساس تو ہوتا ہے مگر اس طور پر گویا پس منظر میں چند موہوم نقطے یا منحنی خطوط ہیں جنھیں دیکھا نہ دیکھا ایک سا ہے نہ ایک میں عبرت ہے نہ دوسرے میں محرومی ان کے مقابلہ میں رسوا اپنی ساری توجہ جزئیات پر صرف کرتے ہیں وہ ساز و سامان کو چھوتے چکھتے اور چھیڑتے ہیں اور بڑے چاؤ سے ایک اک چیز کو دکھاتے ہیں خود الٹ پلٹ کر دیکھتے ہیں انگلیوں سے ان کی سطح کو چمکارتے ہیں اور پلکوں سے ان میں شگاف پیدا کرتے ہیں ایسا کیوں اس لیے کہ یہ ساز و سامان محض ساز و سامان نہیں ہے اس کی تہ میں چند قدریں ہیں یہ قدریں بے جان ہیں ان سے زندگی کی تخلیق نہیں ہوتی مگر یہ زندگی کو تقسیم ہونے سے بچا لیتی ہیں ان میں رس نہیں ہے مگر یہ نظا آب و تاب رکھتی ہیں یہ شیرازہ بند نہیں ہیں مگر ان سے ایک قسم کی یکسانیت پیدا ہوتی ہے جو معاشرت کے ریزوں کو جمع کر کے ایک کل کی صورت میں پیش کرتی ہے وہ انھیں ایک کل میں تبدیل نہیں کر سکتی اس میں انقلاب کی کوئی صلاحیت نہیں بہرحال جزئیات کے اس بیان سے چند باتیں کھل جاتی ہیں۔

(۱) اس معاشرت میں شخص کی وقعت اور وزن بہت کم ہے

(۲) بے جان چیزیں منزل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

(۳) انسان کے اعصاب مردہ، افسردہ اور بے کار ہو کر رہ گئے ہیں انھیں جگانے اور جلانے کے لیے حسین اور رنگین چیزوں کی یہ انجمن سجائی گئی ہے

(۴) ان چیزوں کی ترتیب میں بھی کوئی نیا پہلو نہیں ہے ان کا وجود ایک قسم کا اعادہ[1] ہے جو کچھ ہوتا چلا آیا ہے اور جس
انداز سے ہوتا چلا آیا ہے وہ از خود ہوتا چلا جائے گا کیونکہ اسے ایسا ہی ہونا چاہیے

(۵) یہ باطنی حسن کا اظہار نہیں کرتیں[2] محض حسن کا فریب[3] پیدا کرتی ہیں

ان کے بیان سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہمیں وہ باطنی تناسب ہاتھ آجاتا ہے جس کی روشنی میں آگے بڑھنا ہے
لکھنؤ میں طوائفیں ایک مفید مستقل اور ضروری ادارہ تھیں اس میں اور ہمارے زمانہ کی کسبیوں میں زمین آسمان کا فرق ہے
ہمارے زمانہ میں فنون لطیفہ کے مذاق کی تسکین کے بے شمار سامان موجود ہیں رقص اور موسیقی وسیلۂ محبت ہیں جائز ہیں اس زمانہ
میں خواتین کے لیے ان کا سیکھنا گناہ تھا یہی وجہ تھی کہ فنون لطیفہ کا مذاق رکھنے والے طوائفوں کی طرف رجوع کرتے تھے اور
انھیں اس کی آزادی بھی تھی کیونکہ یہ مذاق اس دور کی معاشرت میں رچا ہوا تھا اور اس کی تشفی بہر طور ضروری تھی طوائفیں
ان فنون میں کمال حاصل کرتی تھیں کشمیری طائفے بھی جو شہروں شہروں مارے مارے پھرتے تھے اور عام طور سے بدن کی لذتیں
فراہم کرتے اور اپنی قیمت وصول کرتے تھے ان فنون کو جاننا ضروری سمجھتے تھے دوسرے اس زمانہ میں خاص و عام کی تفریح
کا کوئی ایسا نظام ایجاد نہ ہوا تھا جو ہمارے دور کی تفریح گاہوں کلب اور انجمنوں میں اپنی معراج کو پہنچ چکا ہے لکھنؤ میں
اس ضرورت کی کفیل بھی یہی مادرانِ بیلی تھیں جن کے نگارخانوں میں احباب جمع ہوتے ادبی مباحث چھڑتے شعر و سخن کے کمال کھلتے
جاتے اور داد وصول کی جاتی تھی جام و مینا سے سرگوشیاں ہوتیں شہر کی چھپی بری خبریں اڑائی جاتیں دوسروں کے کارنامے تکلف
سے سنائے جاتے تھے شام کا وقت لطف سے گزرتا اور فطری کمزوریوں اور خواہشوں کے سامان آسانی سے مہیا ہو جاتے تھے
تیسرے اس زمانہ میں متوسط اور شریف گھرانوں کی عورتوں میں تعلیم کا رواج نہ تھا طوائفیں اپنی دکان لگانے اور بھاری قیمت
وصول کرنے کے لیے اس کمی کو بھی پورا کرتی تھیں موسیقی کے علاوہ صرف و نحو منطق اور فارسی نظم و نثر کی تحصیل پر خاص زور دیا
جاتا تھا طوائفیں شستہ زبان بولتیں لب و لہجہ کی نزاکتوں میں طاق ہوتیں انسانوں کے مرتبہ منزلت اور مذاق کو پہچانتیں
اور نوابین کے بچوں کی تربیت میں ان کا بڑا حصہ ہوتا تھا اس معاشرت میں بھی اگرچہ وہ محترم نہ تھیں مگر مفید ہونے کے باعث
ان کی آؤ بھگت ہوتی تھی اور انھیں خواتین و بیگمات بھی حقارت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔

چوتھے اس دور کے انسانی اعمال چند رسموں کی پابندی تک محدود تھے عورتیں رسمیں اس طرح مناتی تھیں گویا ہر رسم

1 Repetition 2 Illusion 3 Perspective

زندگی کا آخری سانس ہو پیدائش سے لے کر موت تک اور موت کے بعد ہزاروں رسمیں منائی جاتی تھیں اور بیشتر رسموں میں مجرئی ایک ضروری جزو کی حیثیت رکھتا تھا اس لیے طوائفیں اور ڈومنیاں شریف خواتین کی محفلوں کی جان اور ایمان بن گئی تھیں عزاداری جو ایک مذہبی فریضہ تھا اور جس میں حد درجہ سنجیدگی اور متانت واجب تھی اس میں بھی طوائفوں نے سوز خوانی کے کمال سے فائدہ اٹھا کر دخل حاصل کر لیا تھا اور اس طرح دنیا ہی نہیں آخرت بھی ان کے ہاتھ میں چلی گئی تھی

پانچویں اس زمانہ کی طوائفیں ایک وقت میں ایک شخص کے لیے وقف ہوتی تھیں سودا باقاعدگی سے ہوتا تھا مدت اور مشاہرہ متعین ہو جاتے تھے پھر یہ ممکن نہ تھا کہ ہر کس و ناکس کی ان تک رسائی ہو یہی وجہ تھی کہ ان کی محفلوں میں عاست اور حوش مذاقی قائم رہ سکتی تھی اور بعض قومی روایتوں کا احترام ملحوظ رہتا تھا۔

چھٹے، عام طور سے ان طوائفوں کے ڈیرے اور مشترکہ خاندان ہوتے تھے جن کی اپنی مخصوص خوبیاں اور صفات ہوتے تھے کاروبار کا خالص تجارتی انداز نہ تھا یا یوں کہیئے کہ ان کی تجارت میں بھی ایک سلیقہ تھا ان میں سے بعض گانے والیاں ہوتی تھیں بعض محض ناچنے کا پیشہ کرتی تھیں اور بعض محض حسن صورت کے دام لیتی تھیں امراء کی آمدنی میں ان کے لیے ایک خاص مد تھی اور ان میں سے کافی تعداد کسی نہ کسی دربار سے وابستہ ہوتی تھی ایک شخص اور ایک دربار سے علاقہ ختم ہوتا تو کسی اور شخص اور کسی دوسرے دربار سے متعلق ہو جاتی تھی

ساتویں زوال کے اثر اور ان کی مخصوص افادیت کی بنا پر ان کی صحبت سے مولوی، رند، امیر اور غریب کسی کو عار نہ تھا گو یا طوائفیں بھی ان کے روزمرہ میں داخل تھیں وہ ایک فصیح محاورہ تھیں جسے ہر شخص استعمال کر سکتا تھا وہ ایک ایسی تلمیح تھیں جس نے قومی روایتوں اور افسانوں میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا ہو سیر و شکار میں میدان جنگ میں بزم نشاط میں مذہبی رسموں میں ان کا ہونا ضروری تھا یہ اس زمانہ کا مکتب اس کا میکدہ اور اس کی محفل تھیں غالب کے یہاں ہمیں ان کی سچی تصویریں دکھائی دیتی ہیں پڑھانے کے لیے مولوی ہیں موسیقی سکھانے کے لیے بہترین استاد ہیں خانم خود موسیقی کی بڑی اچھی ماہر ہیں اور فن کی باریکیوں کا احترام کرتی ہیں بیگا جان گانے والیوں میں سے ہیں خورشید ناچنے کا فن جانتی ہیں امراؤ جان ناچنے اور گانے دونوں میں ماہر ہیں بسم اللہ جان اپنی صورت کی قیمت لیتی ہیں مدد اصحاب کو چھیڑ چھیڑ کر جلانے اور جھلائے ہوئے چراغوں کی لو کو اکسانے میں ان کا بڑا ہاتھ ہو ان کے ماحول کی جزئیات ان کی بجی رسمیات اور ان کی بود و باش کو دیکھ کر ہم آسانی سے اس زمانہ پر ایک حکم لگا سکتے ہیں یہ لوگ جانے کن بود و دلنز

گمنام گوشوں سے نکال کر لائی جاتی ہیں ان در و دیوار میں گھر کر ان کی زندگی کے سانچے بنتے اور بدلتے ہیں یہ جوان ہوتی ہیں امیروں کے آغوش گرم کرتی ہیں زوال کا آلہ کار بنتی ہیں اسے اپنے نفس کا آلۂ کار بناتی ہیں ان کے جذبات میں ہیجان بھی ہوتا ہے ان کے دماغ میں کبھی کبھی طوفان بھی آتے ہیں لیکن بیشتر سپر ڈالتے ہی بنتی ہے امیر جان، بیگا جان خورشید جان اور بسم اللہ جان میں صرف خورشید جان ایسی ہے جو ایک عرصہ تک زمانہ سے جنگ کرتی رہی ہے تو جھک کر یہ آسمان کے برابر ہوتی ہیں یہ عام طور سے روشنی اور ہوا سے محروم رہتی ہیں رسوا نے جس طور سے خانم کی نوچیوں کو دکھایا اور ان کے کمروں کو سجایا ہے پھر جس طور سے ان کے ملاقاتیوں کی آمد و رفت اور ان کے حجروں کی کیفیت بیان کی ہے اس کے تصور سے دم گھٹنے لگتا ہے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کمروں میں ہمیشہ رات ہی رہتی ہے خاص خاص لوگ آتے ہیں سرگوشیاں کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں حجروں کی فضا بھی کشادہ نہیں معلوم ہوتی نعمت کی الاپ سے آپ کسی نئی اور کھلی فضا میں پہنچ جائیں یہ اور بات ہے ورنہ ان کمروں میں اور ان جگہوں میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا کچھ ایسا خیال بندھتا ہے کہ یہ نوچیاں نہیں جادو کی پڑیاں ہیں جو ایک کمرہ سے نکال کر دوسرے کمرہ میں پہنچا دی گئی ہیں وہاں ساز کی آہنگ اور چہروں کی نمائش سے البتہ چند حواس آزاد ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں لیکن سینہ میں کشادگی اور دماغ میں تازگی کا احساس پیدا نہیں ہوتا وہی گھٹی گھٹی سی کیفیت اور صبح کاذب کا سماں وہی در و دیوار ہر طرف سے یلغار کرتے ہوئے وہی قیمتی لباس جسم دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئی ہیں وہی ادا جو سزا کی صورت اختیار کر چکی ہیں وہ مرد جو شراب پی پی کر زندگی کا بھرم رکھتی ہے نہیں ملفوف کئے رہتے ہیں یہاں تک کہ ہماری طبیعت اکتا جاتی ہے ہم ان در و دیوار کے سائے سے بھاگنے لگتے ہیں مصنوعی مرد و عورت سرگوشیاں کرتے ہوئے اجنبی معلوم ہونے لگتے ہیں دل میں اک ہوک سی اٹھتی ہے کہ کہیں انسانوں کا بہتا ہوا ہجوم نظر آئے کبھی تو سورج کی کرنیں ہمارے رخسار بھی چومیں اور ہم دعا کرتے ہیں کہ ہم اس دنیا کو تھوڑی دیر کے لیے بھول جائیں مگر ہمیں اپنے چاروں طرف وہی گوہر مرزا، وہی نواب جعفر علی خاں اور وہی نواب چھبن دکھائی دیتے ہیں اس ناول میں اس قسم کے بے شمار اشخاص کی مصوری کی گئی ہے ان میں سے بعض کا دائرۂ عمل دوسروں کے مقابلے میں زیادہ وسیع ہے بعض وہ ہیں جن کی ممتاز خوبیوں اور خامیوں کو اس انداز سے ترتیب دیا گیا ہے کہ وہ ہمیں منفرد، زندہ اور مختلف موقعوں اور زمانوں میں کام کرتے دکھائی دیتے ہیں یہ سوچے اور ان کے اعمال ان کی خوبیوں اور خامیوں سے متعین ہو جاتے ہیں، درخواہ وہ ہمارے

ذہن میں ان کی شخصیت کے مظاہروں کی کوئی بہت واضح تصویر نہ آئے پھر بھی ایسا یقین ہوتا ہے کہ ان کے اعمال بس اپنی چند سانچوں میں ڈھل سکتے ہیں جو ان کے مشاہدے نے ہمارے دماغ میں پہلے سے تیار کر دئے ہیں ان اشخاص میں سے بعض کردار ہیں بعض خاکے اور بعض وہ خاکے ہیں جو مضحک ہیں۔ جن کے پردوں میں یہ مزاحیہ طنز چھپا ہوا ہے لیکن اس قسم کی تقسیم عام طور سے مصنوعی ہوتی ہے اور اس میں مطلق العنانی کی جھلک پائی جاتی ہے امراؤ جان میں اصطلاحی معنوں میں کردار دو تین سے زیادہ نہیں ہیں پھر وہ شخص ہیں جن کی گرفت ان خاص موقعوں پر کی گئی ہے جہاں ان کی شخصیت خود بخود بے ارادہ اور خالص فطری انداز میں ظاہر ہوتی ہے بلکہ یوں کہئے کہ پھوٹ پڑتی ہے بعض خاکے وہ ہیں جنھیں کسی خاص موقع پر محسوس نہیں کیا گیا ہے یہ رسوا کے قلم کا کمال ہے کہ ان خاکوں میں زندگی کی تڑپ آگئی ہے لطف یہ ہے کہ ہم ان میں سے کسی کو بھول نہیں سکتے ان میں فن کارانہ اعتماد ہے وثوق ہے اور اتنی گہری واقفیت ہے کہ ان کی صداقت میں شک نہیں ہو سکتا اس ناول کے کردار جادو نہیں کرتے وہ آپ اپنی مثال ہیں وہ کسی جادوگر کے پنجے میں اس طور سے گرفتار بھی نہیں کہ چل پھر نہ سکیں وہ بظاہر ایک دوسرے سے اس طرح پیوست بھی نہیں کہ ان میں سے کسی ایک کو نظر انداز کر دیں تو دفعتہً خط ہو جائے۔ وہ مخصوص ہیں، زندہ ہیں وہ کہیں کہیں خانہ پری کے لیے آتے ہیں مگر وہ بجائے خود اہم نہیں ہیں ان کی قدر و قیمت اس میں ہے کہ وہ ہمیں ایک زندہ طلسمات کی سیر کراتے ہیں۔

اس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے تو اس معاشرت کا آسیب ہم پر قابو حاصل کرنے کا اور رہائی پانے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ ہم ان میں سے ایک ایک کا تعاقب کریں ان کی روح کو علم کے شکنجے میں کس لیں اور حقیقت کے شیشہ میں اتارلیں۔ سب سے پہلے ہمیں گوہر مرزا دکھائی دیتا ہے اس کی پیدائش ایک حادثہ ہے اس حادثہ کی بدولت اس میں زندگی بھی ہے اور غیر ارادی طور پر زندگی سے انتقام لینے کا جذبہ بھی وہ ایک ایسی نسل سے تعلق رکھتا ہے جس کا کوئی وطن نہیں، کوئی خاندان نہیں، جسے زندگی سے کوئی لگاؤ نہیں جو کوئی اخلاقی ضابطہ نہیں رکھتی جو عمل کرتی ہے مگر زندگی میں کوئی اضافہ نہیں کرتی جو بہروپ بھرتی ہے مگر عشق نہیں کرتی وہ ان نوابین کی بدولت وجود میں آئی ہے جو زندگی کے آخری سانس پورے کر رہے ہیں وہ ان ڈومنیوں کے پیٹ سے پیدا ہوئی ہے جن کے بدن کا صرف ایک حصہ زندہ ہے اس لیے اس کے دل و دماغ میں کوئی صلاحیت نہیں البتہ اس کا جسم بیدار ہے وہ اپنے بدن کو قائم رکھنا چاہتی ہے مگر اس کے لیے اس کا بیدار رکھنا ضروری ہے اس کشمکش میں وہ اخلاق کی تمام قدروں کو ٹھکرا دیتی ہے وہ اور کر بھی کیا سکتی ہے وہ ایک ایسی نسل ہے جو بے مقصد پیدا ہوئی ہے اس کے لیے زندگی میں کوئی امکانات نہیں، سنجیدہ محرکات، روزی کا وسیلہ ہنر نہ

زندگی گذارنے کا حوصلہ اچھے گھرانوں میں اس کا گذر نہیں مگر کام و دہن کی لذتوں سے آشنا ہے اس لیے اس میں طرح طرح کے جو نچلے ہیں یہ نسل دور دور پھیلی ہوئی ہے شہروں میں بھی دیہات میں بھی لوگ ان کی پالگت کر چکے ہیں بوڑھی ہو چکی ہیں فضائیں راگ و رنگ اور نشہ سے چور ہیں اس نسل کے نصیب میں بدن کی ٹوٹن ہے اور رگوں کی پیاس کہے تو کیا کرے آزادی کے تصور سے محروم ہو چکی ہے عزت کا احساس باقی نہیں محنت اس کے لیے ننگ ہے اور اس کے باوجود بدن کا ایک حصہ بیدار ہے اور اسے گدگدا گدگدا کر اکسا اور آنچ دے دے کر تپا نا ضروری ہے یہ مرد ہیں مگر ان میں نسائیت ہے ڈومنیوں سے پیدا ہوئے ہیں ڈومنیوں میں رہتے ہیں وہی ان کی پناہ ہیں اور وہی ان کی زمین ہیں یہ طوائفوں کی وقت گذاری کا سامان ہیں نوابین کے دلال ہیں نوجیوں پر مرنے والوں کے رقیب ہیں مردوں میں عورت ہیں اور عورتوں میں مرد دن میں دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں اور رات کی سیاہی میں حملہ کرتے ہیں نہ انھیں کسی سے محبت ہے نہ نفرت ان کے دل مردہ ہیں ان میں احساس کی کوئی تازگی نہیں یہ کٹھ پتلیوں کی طرح ناچتے ہیں اس لیے شوخ معلوم ہوتے ہیں ان میں ایک ہی خواہش بیدار ہے اس کی تسکین یہ کسی نہ کسی طرح کر لیتے ہیں یہی ان کی زندگی کا راز ہے اور یہی ان کی حد نظر یہ طوائفوں اور نوابین کے درمیان حد اوسط ہیں اور معاشرت میں ان کی قدر و قیمت اسی پر منحصر ہے امراؤ جان کے الفاظ میں ".... دوست آشناؤں سے تعریف کرتے ہیں جرکٹ پھنسا کے لاتے ہیں محفل میں بیٹھ کر اہل محفل کو متوجہ کرتے ہیں وہ ناچ رہی ہے یہ تال دیتے جاتے ہیں ہر سم پر آ کرتے ہیں ہر تال پر واہ واہ کر رہے ہیں وہ بھاؤ بتا رہی ہے یہ شرح کرتے جاتے ہیں .... اگر کسی امیر رئیس سے ملاقات ہو گئی انھی کی بدولت اس کو لطف رقابت حاصل ہوتا ہے۔ ادھر وہ چاہتے ہیں کہ رنڈی ہم کو چاہنے لگے ادھر رنڈی جان بچانے کے ان کا کلمہ بھر رہی ہے تماش بین ان سے دبتے رہتے ہیں اگر کسی سے کچھ تکرار ہوئی یہ حمایت کو مستعد شہر کے بانکے ترچھوں سے ملاقات بات کی بات میں پچاس ساٹھ آدمی جمع ہو سکتے ہیں"

یہ الفاظ ان لوگوں کی تعریف میں ہیں جنھیں رنڈیاں اپنا بنائے رکھتی ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ جملے اس مخصوص نسل پر بہترین تبصرہ ہیں اور یہ بھی یوں کہ رنڈیوں کو ایسے لگانے اس نسل کے علاوہ اور مل بھی کہاں سکتے ہیں۔ گو مرزا کی نسل اس معاشرت کے ہر دعوے کی زندہ نفی ہے۔

یہ دعویٰ ذاتی اور خاندانی وجاہت کا ہو، علم و عرفان کا ہو، بدن اور نگاہ کی عصمت کا ہو یا کاروباری
دیانت کا ہر حال میں اور ہر موقعہ پر گو مرزا اسے للکارتا ہے سامنے آ کر نہیں چھپ کر کیونکہ اسے زندہ رہنا ہے۔

راشد علی کو خاندانی وجاہت کا دعویٰ ہے اسے اپنی لیاقت پر بھی ناز ہے یہ اس اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ
ہیں جس نے دوسروں کی کمزوریوں سے قوت کے اسباب فراہم کیے ہیں، یہ وہ طبقہ ہے جو ہمیشہ ان لوگوں کی طرف
دیکھتا ہے جو مادی طور سے بلند ہیں یہ ان کی خدمات بجا لاتا ہے ان کی خاطر زیردستوں پر ظلم کرتا ہے جب تک ان کے
بازوؤں میں دم رہتا ہے ان کے سامنے دم نہیں مارتا جب انھیں کمزور پاتا ہے سازشیں کرتا ہے مصلحت کو حق پر اور
مفاہمت کو معرکہ پر ترجیح دیتا ہے بظاہر صلح پسند ہے مگر قانون اور اقتدار کی پناہ لے کر سب کچھ کر گزرتا ہے خلاف
پر ایمان نہیں رکھتا مگر دین و ایمان کے بارے میں بڑے اخلاق سے کام لیتا ہے انسان سے زیادہ خدا کا قائل ہوتا ہے
کیونکہ خدا کبھی اس کی مصلحتوں میں دخیل نہیں ہوتا ہر آن بدلتا رہتا ہے اس کا نشو و نما بڑی تیزی کے ساتھ ہوتا
ہے اور چند ہی روز میں خاندانی امارت کا سکہ رواں ہو جاتا ہے اس طبقہ کی اولاد عام طور سے خدا کو اعلیٰ ترین قدر
مانتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بہت دور ہے اور یہ کہ قدر اور قیمت میں امتیاز کرنا چاہیے اس دنیا میں قیمت لگا
اور وصول کر لینی چاہیے اعلیٰ ترین قدر سے معانقہ ہوتا رہے گا یہ لوگ کوئی روایت نہیں رکھتے اپنے خاندان
کو دنیا کی آخری روایت سمجھتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں جب تک جوان رہتے ہیں باپ دادا کی دولت
بے دریغ لٹاتے ہیں اور داشتہ رکھتے ہیں جب قویٰ مضمحل ہونے لگتے ہیں تو خود کسی کی داشتہ بن جاتے ہیں
اور بزرگوں کے نام پر سوال کرتے ہیں یہ لوگ اپنے گرد ایک حلقہ بنائے رکھتے ہیں اور اپنے ظاہری اور باطنی
حسن کی تعریف کرتے اور کراتے اور کبھی کبھی اس کا سودا بھی چکاتے ہیں ان کی اکثر باتیں مصنوعی ہوتی ہیں اور یہ
بھی وہاں کھاتے ہیں جہاں ان کے پندار کو تسکین ہوتی ہے راشد بظاہر احمق معلوم ہوتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے
میں پندار ہے یہ پندار خلقی اور امیرانہ نہیں ہے اس لیے اسے زندہ رکھنے کے لیے نئے نئے انداز اختیار کرنے
ہیں اپنی ذہانت کا منوانا اور ان تمام مشاغل میں بڑھنا اور سبقت لے جانا بھی شرط ہے جو امیروں کا وظیفہ ہیں
اس کے لیے شہرت علم کا بدل ہے وقت گذاری اس کا بہترین عمل ہے دولت اس کی سب سے بڑی
ہے احباب کا حلقہ اس کے پندار کی بہترین غذا ہے قوی تر اس کے نزدیک بہتر ہے اور بہتر اس کے لیے مثال ہے

تقلید میں وہ غلو کو برا نہیں سمجھتا، خواہ اس کی مونچھیں بقول رسوا کے "چوہیا کی دم" ہو جائیں۔ وضعداری کو
اچھی نگاہ سے دیکھتا ہے جس رنڈی سے ایک شب کے لیے واسطہ ہو گیا اس کی نائکہ کو مجمع عام میں "اماں جان" کہنے سے باک
نہیں۔ شعر و شاعری میں اس درجہ کمال پہنچایا ہے کہ "ریختی گویوں سے پہلے آپ کا کلام" پڑھا جاتا ہے۔ فراخدلی میں اپنی مثال
نہیں رکھتا کیونکہ والد مرحوم ترہوت نیل کے روپیہ سے ایک بڑا علاقہ اس کے لیے چھوڑ گئے ہیں۔ پھکڑپن سے بھی عار نہیں ورنہ
طبیعت کی رسائی کیا معنی؟ ذہنی اور جذباتی طور پر بھی خاصہ بلند ہے اس لیے یاروں کے کہنے سننے سے امراؤجان کا خیال پیدا
ہوتا ہے زندہ ہے اس لیے خیال ترقی کرتے کرتے "انستاں" تک پہنچ جاتا ہے مخلص ہے اس لیے آخر کو عشق اور اس کے بعد "جنون"
ہو جاتا ہے دل میں پورا ایمان رکھتا ہے اس لیے دعا تعویذ کی "تاثیر" سے پانچ ہزار روپے پر توڑ ہوتا ہے

یہ راشد نہیں ایک پورا طبقہ ہے جو مصنوعی اخلاق، مصنوعی پندار، مصنوعی عشق، مصنوعی شعر و شاعری میں کمال
رکھتا ہے یہ اپنے کمالات سے شرمندہ نہیں، مردہ بھی نہیں کیونکہ قوی تر لوگوں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے عمل کرتا ہے ان
کی تقلید میں خلوص برتتا ہے اس کے پاؤں تلے زمین ہے کیونکہ اس کے پاس بزرگوں کی دولت بھی ہے اور وجاہت خاندانی
کا تمغہ بھی اس کے دامن میں اخلاقی قدریں نہیں مگر دعوے تو ہیں اسے چھپ کر وار کرنے کی ضرورت نہیں اس کی زندگی کوئی
حادثہ نہیں۔

نواب جعفر علی خاں اور نواب چھبن اس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، جو آپ اپنے دام میں گرفتار ہے جو اس معاشرت
کا خالق بھی ہے اور اس کی مخلوق بھی کبھی زمین سجدے کو جھومتی اور اپنا گریبان چاک کر کے اس کی تلوار کے قبضہ کو چومتی تھی مگر اب ایسا نہیں
ہے صدیاں گزر گئی ہیں وہ زندہ اصول جنھوں نے زمین کے سینہ کو برما دیا تھا اب مردہ ہو چکے ہیں، ریاست کے وہ قوانین جو
سماج کے اعلیٰ تصور سے پیدا ہوئے تھے اب ظلم کا آلۂ کار بن گئے ہیں، وہ جمالیاتی قدریں جن سے فنون لطیفہ میں توازن و تناسب
اور مردانگی پیدا ہوئی تھی اب محض صورت پرستی میں تبدیل ہو کر رہ گئی ہیں دولت جو پہلے بڑی حد تک اشخاص کی محنت اور
طبقوں کی افادیت کے مطابق تقسیم ہوتی تھی اب ایک مدت سے چند لوگوں کی میراث بن گئی ہے تقدیر پرستی عام ہے اور خدا کے
تصور میں انقلاب کی کوئی قوت باقی نہیں، یوں کہنا چاہیے کہ یہ قدریں ایک مدت سے اپنی افادیت کھو چکی تھیں اب ان کا جوا
ڈھونگ پیدا ہو گیا ہے جس میں مغرب کے سیلاب نے کامد باد اور حیات و کائنات کی کچھ اور قدریں بھی شامل کر دی ہیں وہ طبقہ
ابھی موجود ہے جس نے اس تہذیب کو جنم دیا تھا اس کے ہاتھ میں دولت ہے اس کے پاس برائے نام طاقت بھی ہے مگر اس

ہیں نہ خود کو بدلنے کی صلاحیت ہے نہ وہ عوام سے زندگی مستعار لے سکتا ہے نہ اس میں حملہ آوروں کے مقابلے کی ہمت ہے۔ اس کے دل اور دماغ میں کوئی ہل چل بھی نہیں ہے کیونکہ وہ اپنی ہار مان چکا ہے۔ باہر سے ایک زندہ قوم نئے طمطراق کے ساتھ آئی ہے اور اس نے اپنی کشتیاں جلا دی ہیں، وہ ان کے قلعوں میں شگاف پیدا کر رہی ہے۔ اندر عوام بدل رہے ہیں ان میں بے چینی ہے اور ان کے دلوں سے ان کے اقتدار کا خوف نکل چکا ہے۔ خود ان میں کوئی اندرونی طاقت نہیں جس سے اس انقلاب کی حقیقت پر قابو پاسکیں وہ ذہنی اور روحانی طور پر کھوکھلے ہیں ماضی میں رہتے ہیں حال کو سمجھ نہیں پاتے، مستقبل کا کوئی آسرا نہیں، ان کے اخلاق و آداب ان قلعوں کی مثال ہیں جو طوفانی سمندر کی سطح پر دکھائی جائیں انھیں خود نہیں معلوم کہ وہ کیا ہیں اور یہ تصویریں جو چاروں طرف دکھائی دیتی ہیں زندہ ہیں یا محض فریب ہیں وہ جنسی تلذذ میں مبتلا ہیں اس لیے نہیں کہ انھیں اس میں کلاسیکی نغموں کا زیر و بم دکھائی دیتا ہے اور نہ اس لیے کہ وہ کوئی میدان سر کر کے آئے ہیں اور ان کے اعصاب میں تناؤ پیدا ہو گیا ہے بلکہ محض اس لیے کہ وہ جسمانی طور پر کمزور ہیں اور ان کا وقت آخر ہے اور آسے کسی نہ کسی طور سے بہلانا ہے ان کے نزدیک دولت کی نمائش بھی اسی طرح ممکن ہے اور بزرگوں کی عیش پرستی کا احترام بھی اسی صورت سے ہو سکتا ہے وہ محض روایتیں ہیں شرافت اور جاہ و جلال، فنون اور خانہ داری، مصاحبین اور ماتم، کھیل اور کہانیاں، مذاق اور فحاشی، نفاست، فاتحہ اور نیاز، وہ خود روایت ہیں۔

اس روایت پر مردنی چھا گئی ہے مگر یہ ابھی قطعی طور پر مٹی نہیں ہے کچھ تو اس لیے کہ عوام بیدار نہیں کچھ اس لیے کہ اس میں کم از کم ظاہری شان و شوکت باقی ہے کچھ اس لیے کہ اس کا یک بیک مٹا دینا مغرب کی سیاسی مصلحت کے خلاف ہے اور کچھ اس لیے کہ بعض افراد میں بعض خوبیاں بھی ہیں اور ان کے فیض سے کچھ شمعیں بھی فروزاں ہیں۔

رسوا نے اس طبقہ کے بعض مخصوص افراد کے خاکے دئے ہیں ان میں دو تین خاکے بہت جاندار ہیں نواب جعفر علی خاں کبھی نہیں بھولتے "سن شریف کوئی ستر برس کے قریب تھا منھ میں ایک دانت نہ تھا نشت خم ہو گئی تھی عمر میں ایک بال سیاہ نہ تھا مگر اب تک اپنے کو پیار کرنے کے لائق سمجھتے تھے، ہائے وہ ان کا کچلی کا انگرکھا اور گلبدن کا پاجامہ، لال نیفہ، مصالحہ دار ٹوپی، کا کلیں بٹی ہوئی"

"دو گھنٹے کے لیے مصاحبت کرکے چلی آتی تھی اور تکلف سنئے نواب بوڑھے ہو گئے تھے مگر کیا مجال نو بجے کے بعد دیوان خانے میں بیٹھ سکیں اگر کسی دن اتفاق سے دیر ہو گئی کھلائی آکے زبردستی اٹھالے جاتی تھی، نواب صاحب

کی والدہ زندہ تھیں ان سے اسی طرح ڈرتے تھے جس طرح پانچ برس کا بچہ ڈرتا ہے بیوی سے بھی انتہائی محبت تھی بچپن میں شادی ہوئی تھی مگر سوائے عشرہ محرم اور شبوں کے کسی دن علیحدہ سونے کا اتفاق نہ ہوا تھا فن موسیقی میں ان کو کمال تھا کیا مجال کوئی ان کے سامنے گا سکے اچھے اچھے گویوں کو ٹوک دیا سوز خوانی میں یکتا تھے"

نواب صاحب کی خوبیوں سے انکار نہیں ہو سکتا لیکن یہ ان کی انفرادی خوبیاں ہیں جن کی بدولت وہ دوسروں سے ممتاز ہیں، "مگر سرکار سے ایک رنڈی کا رسم بندھا ہوا تھا" "دو گھڑی کے لیئے مصاحبت کر کے چلی آتی تھی" "کھلائی آ کے زبردستی اٹھا لے جاتی" "بیوی سے علیحدہ سونے کا اتفاق نہ ہوا تھا" یہ چار فقرے ان کی روایت ان کے عوائد رسمیہ ان کی نسائیت اور کمزوری پر خاصی روشنی ڈالتے ہیں اور ان کے سفید بالوں کا احترام کرنے کے باوجود ہمیں ان پر زیر لب ہنسی آتی ہے

ان کے برعکس نواب چھبن ہیں ان میں حرارت و مردانگی ہے غالباً وہ زندگی کی یکسانیت سے اکتا گئے ہیں ان کے دل میں محبت کی گرمی بھی ہے اور وہ اس کی خاطر سب اور کچھ بھی سکتے ہیں مگر یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو انعام کی ہوس میں ایک بار تو سب کچھ لٹا دیتے ہیں مگر انعام نہیں ملتا تو مایوس بھی جلد ہو جاتے ہیں اور پرانی روش سے بیزار ہو کر میانہ روی کا دامن تھام لیتے ہیں ان میں محبت ہے وہ خاندان سے بغاوت بھی کرتے ہیں خانم کی بے رخی اور بسم اللہ جان کی بے وفائی سے ان میں جینے کا حوصلہ نہیں رہتا وہ ڈوب کر جان دے دینا چاہتے ہیں مگر پھر ابھر آتے ہیں اور گومتی کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر ماضی سے مفاہمت کر لیتے ہیں ان پہلوؤں کو دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی کی سچی تڑپ ان میں بھی نہ تھی بسم اللہ کی خاطر سب کچھ قربان کر دینا بھی ایک اتفاقی لغزش تھی جس میں ان کے لیے عبرت کا کافی سامان تھا وہ اپنے گناہوں پر پچھتائے سب نے انھیں معاف کر دیا لیکن زندگی انھیں معاف نہیں کر سکتی" نواب سلطان ان سے ذرا مختلف ہیں ان کا حصہ ناول میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے اس لیے ہم ان کے بارے میں آئندہ کچھ کہیں گے سرسری کچھ اور بھی رسوا نے ان خاکوں میں اپنے بیان سے زندگی کا رنگ بھر دیا ہے امراؤ جان میں اس قسم کے بے شمار خاکے ہیں یہ خاکے اس لیے اور بھی جاندار ہو گئے ہیں کہ ان میں کم سے کم الفاظ، اپنے بہترین سیاق و سباق میں شخص کی قدر و قیمت اور اس کے موقع و محل کا لحاظ رکھتے ہوئے استعمال کئے گئے ہیں ساتھ ہی ایک اور خوبی ہے رسوا چہرے کو بھی اس انداز سے دکھاتے ہیں کہ اس میں نامحسوس طور پر مزاج کا خاصہ اور بانکپن ابھر آتا ہے یہ ہمیں پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ"

مزاج زمین کے کس حصہ میں نشو و نما پا سکتا ہے۔ اس طور سے زمین پودے اور پھول پتوں میں ایک قسم کی فطری استواری اور خاکے میں وقتوں پیدا ہو جاتا ہے۔ یوں تو عام طور سے ان خاکوں میں م[illegible] طنز ہے مگر جہاں کہیں مولوی صاحبان کے خاکے دیے ہیں وہاں اس میں قیامت کا نکھار پیدا ہو گیا ہے۔ ان خاکوں میں مذہبی تضاد دوسروں کے مقابلے میں زیادہ پیدا ہوکر چہرہ مہرہ وضع قطع اور بات چیت سے ایک دعویٰ ہوتا ہے اور فوری طور پر حرکات و سکنات سے اس کی نفی سرزد ہو جاتی ہے۔ کھینچے ادھر ہیں کھینچ ادھر جاتے ہیں اور بعض اوقات یہ تضاد ایک ہی لمحے میں اس تیزی کے ساتھ واقع ہوتا ہے کہ اس کی گرفت مشکل ہو جاتی ہے۔

ان صاحبوں میں کمزوری بھی ان کی حیثیت کی مناسبت سے ہے۔ یہ خدا اور انسان کے درمیان واسطہ ہیں مگر عام طور سے خدا کی بارگاہ میں بود و باش رکھتے ہیں اور انسانوں پر وحی و الہام کی طرح نازل ہوتے ہیں۔ یہ جو بات کہتے ہیں آخری ہوتی ہے۔ ان کے پاس جو صداقت ہے وہ مکمل ہے۔ یہ انسان کو محض اس لیے کشتنی سمجھتے ہیں کہ اس میں الٰہی صفات نہیں ہیں۔ یہ ہر قسم کی پیشین گوئی کر سکتے ہیں اور اگر آپ اس پر ایمان نہ لائیں تو آپ کو بیمارانہ دعائیں دیتے ہیں۔ زمین سے ان کا علاقہ نہیں مگر آکاس بیل کی طرح زمین کے تناور درختوں پر چھا جاتے ہیں اور صدیوں تک ان کا رس پی پی کر سدا [illegible] ہیں۔ چھا جانے اور چھائے رہنے کی پیاس پھر بھی نہیں بجھتی۔ انھیں علم کی ضرورت اور فائدہ کا احساس نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ یہ زندگی کو جامد سمجھتے ہیں اس لیے ان کا ہر قانون تمام انسانوں اور تمام زمانوں کے لیے ہوتا ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ ان کے نزدیک ایک ہی وقت میں کوئی بات سچی اور جھوٹی نہیں ہو سکتی اور جو بات کسی وقت بھی ثابت ہو چکی ہو ہر وقت اور ہر موقعہ کے لیے ویسی ہی ہے۔ انسان ان کے خیال میں چیزوں کا پیمانہ نہیں ہے۔ خود چیزوں کا پیمانہ ہیں جن سے اپنے علاوہ ہر چیز ناپی جا سکتی ہے اور یہی ان کی سب سے بڑی طاقت اور سب سے بڑی کمزوری ہے اور اسی باعث ان کے خیال اور عمل، دعوے اور دلیل میں تضاد پیدا ہوتا ہے۔ ان [illegible] مولوی صاحب کا ذکر تو ہم ابتدا ہی میں کر چکے ہیں جو زیتون کی تسبیح ہاتھ میں لیے پائنچے چڑھائے درخت کی پھننگ پر چڑھ گئے تھے اور "کبھی آسمان کو دیکھتے تھے اور کبھی بسم اللہ کو" اس خاکہ میں بسم اللہ کا کردار بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ یہاں ایک اور خاکہ دیکھیے یہ مولوی صاحب کانپور کی ایک مسجد میں رہتے ہیں وہاں سوئے اتفاق سے امراؤ جان، ہماری دکھیاری قسمت کی ماری پہنچ جاتی ہیں۔ یہاں ان میں جو مکالمہ ہوتا ہے وہ توجہ کے لائق ہے:

مولوی صاحب اگرچہ بہت ہی بے تکے تھے مگر میری لگاوٹ اور دلفریب تقریر نے جادو کا اثر کیا بھلا جواب کیا منھ سے نکلتا ہکا بکا ادھر اُدھر دیکھنے لگے، میں سمجھ گئی کہ دام فریب میں آگئے

مولوی۔ (تھوڑی دیر کے بعد بہت سنبھل کے) اچھا تو آپ کا کہاں سے آنا ہوا؟

میں "جی کہیں سے آنا ہوا مگر بالفعل تو یہیں ٹھہرنے کا ارادہ ہے"

مولوی (بہت گھبرا کر) "مسجد میں؟"

میں "جی نہیں بلکہ آپ کے حجرے میں"

مولوی "لاحول ولا قوۃ"

میں ۔ "اوئی مولوی صاحب مجھے تو سوا آپکے کوئی اور نظر نہیں آتا"

مولوی "جی ہاں! تو میں اکیلا تو رہتا ہوں، اسی لیے تو میں نے کہا، مسجد میں آپکا کیا کام؟"

میں ۔ "یہ کیا خاصیت ہے کہ جہاں آپ رہتے ہوں وہاں دوسرا نہیں رہ سکتا مسجد میں ہمارا کچھ کام نہیں۔ یہ خوب کہی آپ کا کیا کام ہے؟"

مولوی ۔ "میں تو لڑکے پڑھاتا ہوں"

میں ۔ "میں آپ کو پڑھا دوں گی"

مولوی "لاحول ولا قوۃ"

میں ۔ "لاحول ولا قوۃ یہ آپ ہر دفعہ لاحول کیوں پڑھتے ہیں، کیا شیطان آپکے پیچھے پھرتا ہے"

مولوی "شیطان آدمی کا دشمن ہے اس سے ہر وقت ڈرتے رہنا چاہیے"

میں ۔ "خدا سے ڈرنا چاہیے، موئے شیطان سے کیا ڈرنا اور یہ کیا آپ کہاں آدمی ہیں؟"

مولوی (ذرا بگڑ کر) "جی ہاں! اور کون ہوں؟"

میں ۔ "مجھے تو آپ جن معلوم ہوتے ہیں، اکیلے اس مسجد میں رہتے ہیں۔ آپ کا دل نہیں گھبراتا؟"

مولوی "پھر کیا کریں۔ ہمیں تو اکیلے کی عادت ہے"

میں اسی سے تو آپکے چہرہ پر وحشت برستی ہے وہ آپنے سنا نہیں ع تنہا منشیں کہ نیم دیوانگی است"

مولوی - "اجی کچھ سہی جس حال میں ہم ہیں خوش ہیں آپ اپنا مطلب کہئے"

میں - "مطلب تو کتاب دیکھنے سے حل ہوگا بالفعل زبانی مباحثہ ہے"

"شیطان آدمی کا دشمن ہے اس سے ہر وقت ڈرتے رہنا چاہیئے" مولوی کا یہ جملہ ایک دعویٰ ہے جس کی دلیل کچھ نہیں یہ نعرۂ جنگ بھی ہے مگر کس کے خلاف مگر شیطان ہے کہاں؟ ہوسکتا ہے مولوی میں ہو مگر بظاہر تو ایسا نہیں تو پھر امراؤ جان میں ہوگا مگر امراؤ جان میں شیطان کہاں سے آیا غالباً مولوی کے چھپے ہوئے احساسات نے تو پھر جو نعرۂ جنگ نہیں فریاد ہے، مگر مولوی تو شیطان کو مات دے سکتا ہے مگر شیطان ہے کہاں باہر تو ہے نہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے نفس کو مات دے سکتا ہے مگر ایسا ہوتا تو وہ فریاد ہی کیوں کرتا؟ کیا وہ دو لمحوں میں ہار گیا اول ہی کہتا ہے۔ یہ جملہ بھرپور طنز ہے اور یہ ایک شخص پر نہیں پوری جماعت پر ضرب لگاتا ہے ان کے عقاید کیا ہیں یہ انسانی سطح سے کتنے بلند ہیں عام انسانوں پر کس کس طرح وار کرتے ہیں ان میں اندرونی تضاد ہے یہ تضاد ان کے اخلاقی نظام کی جان ہے یہ لوگ بیک وقت دعویٰ بھی ہیں اور اس کی نفی بھی

مولوی صاحب کا یہ خاکہ کہانی میں ذرا آگے چل کر آتا ہے ہم سے ایک غلطی ہوگئی مگر مجبوری کی بنا پر اس میں کوئی مضائقہ بھی نہیں کیونکہ ہمیں زمانہ کو دیکھنا ہے وقت کو خود پر طاری کر لینا ہمارے مقصد کے خلاف ہے بہرصورت اب تک جو کچھ ہوا ہے وہ یا تو خانم کے دالان میں یا نوابین کے ایوانوں میں یا کسی اور چہار دیواری میں ہوا ہے ان بند کمروں میں عام طور سے وہی باتیں نظر آتی ہیں، فانوس اور چھت گیریاں قیمتی اور بھاری بھرکم لباس، نخرے، بار بار کھلتے اور بند ہوتے ہوئے دروازے، روپیہ، قالین دریں، گانے بجانے کی آوازیں، ناچتے ہوئے بدن، تھرکتی ہوئی بوٹیاں، رنگے ہوئے چہرے اور جلتی ہوئی آنکھیں، لوچیاں جادو کی پڑیاں ہیں جو ایک کمرے سے دوسرے کمرہ میں اور دوسرے سے تیسرے میں بہ حفاظت تمام لے جائی جاتی ہیں اور ہمیں بھی ان کے ہمزاد کی طرح ان کی پرچھائیوں کے ساتھ ساتھ چلنا پڑتا ہے ہم اکتا جاتے ہیں ہمارا جی چاہتا ہے کہ ہم یہ بندشیں توڑ ڈالیں اور جست لگا کر کسی ایسی فضا میں پہنچ جائیں جہاں انسانوں کا ہجوم ہو جہاں چاند ہو، سورج ہو، بادل ہوں کچھ ہو شیشہ گر کی دکان نہ ہو۔ رسوا ایک اچھے فن کار کی طرح ہمارے دل کی بات پالیتے ہیں۔ انھیں اپنے مقصد کے لیے بھی اس فضا سے نکلنا ضروری معلوم ہوتا ہے وہ ہمیں اس معاشرت کی چند اور جھلکیاں بھی دکھانے چاہتے ہیں ابھی تک ہم نے فطری روانی کے ساتھ زندگی کا بہاؤ نہیں دیکھا ہے مگر یہ تو ساون کا مہینہ ہے

سہ پہر کا وقت ہے بارش برس کے کھل گیا ہے چوک کے کوٹھوں اور بلند دیواروں پر جا بجا دھوپ ہے ابر کے ٹکڑے آسمان پر ادھر ادھر آتے جاتے نظر آتے ہیں پچھم کی طرف رنگ رنگ کی شفق پھولی ہے۔

"آج جمعہ کا دن ہے ہر جمعہ کو چوک میں سفید پوشوں کا مجمع ہو جاتا ہے عیش باغ کا میلہ بھی اسی روز ہوتا ہے میلے میں وہ بھیڑ ہوتی ہے کہ اگر تھالی پھینکو تو سروں سر جائے، جا بجا کھلونے والوں، مٹھائی والوں کی دکانیں ہیں، خوانچے والے، میوہ فروش، ہار والے، تنبولی، ساقنیں، غرضکہ جو کچھ میلوں میں ہوتا ہے سب کچھ ہے" یہ ہجوم دیکھ کر ہمیں تسکین ہوتی ہے یہاں ہمارے حواس خمسہ بھی آزاد ہیں اب تک ہم خاص قسم کے گانے اور سرگوشیاں سنتے اور خاص قسم کے چہرے دیکھتے چلے آئے تھے، یہاں پہلی دفعہ ہمیں ساقنیں نظر آتی ہیں وہ کیسی ہی سہی بہر حال ہمیں اپنی قوت باصرہ میں طراوت سی محسوس ہوتی ہے یہ لوگ بے تکی آوازیں لگاتے ہیں اور ایک دوسرے پر آوازے کستے ہیں پھر بھی ہماری قوت سامعہ ان کی کرخت اور ناہموار آوازوں سے لطف اندوز ہوتی ہے۔ ہمارے وجدان میں ہر قسم کے انسانوں کو دیکھ کر گدگدی سی ہوتی ہے اور ہم ان بے شمار چہروں میں دلوں کے پرتو دیکھتے ہیں۔ "آیا خوش ہیں یا نہیں؟ نوابوں اور نوچیوں کی طرح یہ بھی مصنوعی ہیں یا ان میں آزاد پرندوں کی سی بات ہے؟ یہ جنسی طور پر صحت مند ہیں یا ہر انجمن کی رونق ہیں؟ ہمارے دل میں یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں۔" ایک انسانی جذبہ ہے اس کی مدد سے ہماری نظر وسعت اور ہمارے دل و دماغ رہائی حاصل کرتے ہیں، سوا پھر ہماری مدد کرتے ہیں، یہ ان کی فنی مہارت کا ثبوت ہے" ایک صاحب ہیں وہ اپنے تنزیب کے انگرکھے اور اودی صدری، بنکے دار ٹوپی، چست گھٹنے اور مخملی چڑھویں جوتے بڑبڑاتے ہوئے چلے جا رہے ہیں ایک صاحب رنگا ہوا دوپٹہ سر سے آڑا باندھے رنڈیوں کو گھورتے پھرتے ہیں۔ ایک صاحب آئے تو ہیں میلہ دیکھنے مگر بہت ہی مکدر، جیں بہ جبیں، کچھ چپکے چپکے بڑبڑاتے بھی جاتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ بیوی سے لڑ کر آئے ہیں جن باتوں کے جواب بر وقت سوجھے نہ تھے وہ اب یاد کر رہے ہیں ایک صاحب اپنے چھوٹے سے لڑکے کی انگلی پکڑے اس سے باتیں کرتے چلے آتے ہیں۔ ہر بات میں اماں کا نام آتا ہے۔ اماں کھانا پکاتی ہوں گی اماں کام میں ماندہ ہے اماں سو رہی ہوں گی، اماں جاگتی ہوں گی، بہت شوخی نہ کیا کرو نہیں تو اماں حکیم کے یہاں چلی جائیں گی۔ ایک صاحب سات آٹھ برس کی لڑکی کو سرخ کپڑے پہنا کے لائے ہیں کندھے پر چڑھائے ہوئے ہیں ناک میں ننھی سی نتھنی ہے اونچی چوٹی گندھی ہوئی ہے لال شالباف کا موباف پڑا ہے ہاتھوں میں چاندی کی چوڑیاں ہیں معصوم کے دونوں ہاتھ زور سے پکڑے ہیں، کلائیاں دکھی جاتی ہیں کوئی چوڑیاں نہ اتار لے کہیئے پھر پہنا کے لانا ہی کیا ضرور تھا۔

لیجئے دوسرے صاحب ایک اور ان کے یار غار بھی ساتھ ہیں فرمائشی گالیاں چل رہی ہیں اماں ہاں تولا ڈکھٹ سے پیسہ تمبولی کی دکان پر پھینکا معلوم ہوا آپ بڑے تونگر ہیں پیسہ دو پیسہ کی آپ کے آگے کیا اصل ہے؟

"سرِشام سے دو گھڑی رات گئے تک میلے کی سیر کی پھر گھر چلنے کی ٹھہری اپنے اپنے میانوں میں سوار ہوئے اب جو دیکھتے ہیں تو خورشید کا میانہ خالی ہے ان کا کہیں پتہ نہ ملا"

اس موقعہ پر اگرچہ انسانی مرقعے ہماری توجہ کا مرکز ہونے چاہئیں اور ہوں گے، لیکن اگر ہم رسوا کی منظر نگاری بھی دیکھتے چلیں تو فائدہ سے خالی نہیں نظارہ دکھانے سے پہلے رسوا ہمیں بتا دیتے ہیں کہ "یہ ساون کا موسم ہے" اس جملے سے ہمارے دل میں چند احساسات بیدار ہو جاتے ہیں جو ہمارے تجربوں کی بنا پر ایک ہالہ سا بنا لیتے ہیں ظاہر ہے کہ اس ہالے میں کچھ مخصوص چیزیں ہی ابھر سکتی ہیں ساون کے موسم میں پانی برستا ہے آسمان دھواں دھار ہو جاتا ہے اس وقت بھی آسمان سے دودھ کی دھاریں پھوٹ سکتی ہیں یہ بات توقع کے عین مطابق ہے مگر "پانی برس چکا ہے" اس جملے کی مدد سے ایک گریز ہوتا ہے اور وہ لمحہ ہماری گرفت میں آجاتے ہیں جو گذر تو چکے ہیں مگر حال کے لمحوں پر اپنا اثر چھوڑ گئے ہیں اس کے بعد کیا ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے اس کے بارے میں کچھ واقفیت تو ادبدئے ہوئے جملے میں اور کچھ ہمارے گذشتہ تجربوں میں موجود ہے ہم پیشین گوئی کر سکتے ہیں، بشرطیکہ ہمیں وقت کا احساس ہو، یہ احساس بھی تیسرے جملے سے ہو جاتا ہے یعنی "سہ پہر کا وقت ہے" اب ہمیں دو باتیں معلوم ہیں "پانی برس کر کھل چکا ہے" اور "سہ پہر کا وقت ہے" تیسری بات از خود ہمارے ذہن میں آ سکتی ہے وہ رسوا کے الفاظ میں یہ ہے "چوک کے کوٹھوں اور بلند دیواروں پر جا بجا دھوپ ہے، ابر کے ٹکڑے آسمان پر آتے جاتے دکھائی دیتے ہیں" آسمان اور چوک کے کوٹھوں کا نام لے کر رسوا نے اس مخصوص فضا کے خطوط کو اور بھی واضح اور گہرا کر دیا ہے۔ ہم ان کے سایے میں چلتے ہیں اور ہماری نگاہیں وہاں پڑتی ہیں جہاں زمین اور آسمان ملتے دکھائی دیتے ہیں یہیں ہمارے ذہنی نقش اور اس نظارے کی تصویر کا حاشیہ ہونا چاہیئے یہاں پہنچ کر رسوا کا آخری جملہ ہمارے کام آتا ہے "رنگ رنگ کی شفق پھولی ہوئی ہے"

آخری جملہ پڑھتے ہی ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ فضا نے ہمیں چاروں طرف سے ڈھانپ لیا۔ تصویر پوری ہو گئی اسے بنانے میں رسوا نے جہاں رنگ سے کام لیا ہے وہاں اس میں بڑی نازک منطق بھی ہے کسی چیز کو جا

یا کسی فضا کو متعین کرنے کے لیے منطقی طور پر جو سوال ہمارے سامنے آتے ہیں یعنی کہاں ہے؟ کب ہے؟ کیوں ہے؟ ان کے جواب ان چار جملوں میں اس خوبصورتی اور سلیقہ سے آگئے ہیں کہ ہمیں اس دعویٰ کے ماننے میں کوئی تامل نہیں ہو سکتا کہ رسوا کے بیان واقعہ میں اور شعر میں کوئی فرق نہیں ان کی منطق اتنی نازک ہے کہ وہ شعر کے جامہ ہی میں سما بھی سکتی ہے۔

اس ہجوم کو دیکھئے اگر آپ اسے محض تکنیک کے اعتبار سے دیکھیں تو رسوا اس معیار پر نہ صرف یہ کہ پورے اتریں گے بلکہ ان کے یہاں ہم پھر کسی ایسی بات سے دوچار ہوں گے جسے ماورائے سخن کہنا چاہیئے۔

بہرحال یہاں ہمیں صرف تین باتیں یاد رکھنی چاہئیں رسوا بالکل اندا میں خورشید جان کے حسن اس کی جامہ زیبی اور ادا ہی کی تصویر کھینچتے ہیں۔ یہ تصویر کچھ ایسی ہمدردی اور ہمدردی کے ساتھ پیش کی گئی ہے کہ قاری کے لیے اس کا بھلا دینا کسی طرح ممکن نہیں، میلے کی سیر کے وقت وہ ہمارے دل و دماغ میں بسی رہتی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ اس میلے کے لیے پس منظر کی موسیقی کا حکم رکھتی ہے، درحقیقت یہ لہریں سیلاب کی طاقت اور رفتار کا پیمانہ ہیں۔ یہ اس کی سطح سے ابھر کر ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں آگے چل کر وہ اس بہاؤ سے دو چار لہریں چن لیتے ہیں ان لہروں میں ایک خاص قسم کا بانکپن ہے ہم انھیں پاس سے دیکھتے ہیں اور ان کے نفس کی گہرائی تک پہنچنا چاہتے ہیں۔

ظاہر ہے ہم ان میں اور ان کے علاوہ دور و نزدیک جو کچھ دیکھتے ہیں امراؤ جان کی آنکھ سے دیکھتے ہیں اس لیے اس ہجوم پر حکم لگاتے وقت ہمیں امراؤ جان کی پیشانی کے خطوط دیکھنے ہوں گے، واپسی کے وقت اس پر کیا تاثرات ہیں اس کے منہ کا ذائقہ کیسا ہے؟ یہ تو ہمیں پہلے سے معلوم ہے کہ امراؤ جان کے ساتھ ان کی محرم سواریاں ہیں جن کے میانے موتی جھیل کے کنارے، بڑی دیر سے ان کے منتظر ہیں یہاں پہنچ کر کیا ہوتا ہے اسے امراؤ جان کے الفاظ میں سنیے "دو گھڑی رات گئے تک میلے کی سیر کی پھر گھر چلنے کی ٹھہری اپنے اپنے میانوں میں سوار ہوئے اب جو دیکھتے ہیں خورشید کا میانہ خالی ہے ان کا کہیں پتہ نہ ملا" چلتے وقت امراؤ جان نے اس کے جوبن کو جی بھر کر دیکھا تھا شاید خورشید جان کو اس کی نظر لگ گئی راستہ میں اسے یہ دیکھ کر ہنسی آئی تھی کہ ایک صاحب ایک بچی کے ہاتھ زور سے پکڑے ہیں کہ کوئی اس کی چوڑیاں نہ اتار لے لوٹتے وقت اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی نے زمیں پر انگارے بچھا دیے ہیں اس واردات میں رمزیہ طنز بھی ہے اور مجموعی تاثر بھی سنسنی بھی ہے اور ایک بھید بھی جس کے جلد یا بدیر کھلنے کی توقع ہے مگر جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ یہ فن کار کی مشیت ہے اور اس میں کسی کو چارہ نہیں ہم نے کہا تھا کہ رسوا نے اس بہاؤ سے چند لہریں چن لی ہیں انھیں ہم کہنا

چانچنا اور سمجھنا ضروری ہے یہ لہریں ہماری اور آپ کی طرح انسان ہیں یہ زندہ ہیں ہم ایسی ٹھیک ٹھیک کردہ راز دریافت
کر سکتے ہیں جو اُن کے بطون میں چھپا ہوا ہے ان کے چہرے بولتے ہیں اور ان کی زبان میں لکنت نہیں ان میں سے ایک صاحب
مخملی چڑھواں جوتے پر اترائے ہوئے چلے جاتے ہیں" انھیں دیکھ کر ہمیں ہنسی آتی ہے مگر وہ یہ کہتے ہوئے کہ "خوشی کسی کی میراث
نہیں ہے اور کبھی کبھی تو ہم آپ بھی مسکرا سکتے ہیں اتفاقاً ہی سہی" آگے بڑھ جاتے ہیں۔

"دوسرے صاحب رنڈیوں کو گھورتے پھرتے ہیں" یہ کوئی اچھی بات نہیں وہ کہہ بھی سکتے ہیں کہ میرے بدن میں چیونٹیاں
سی کاٹتی ہیں مگر ایسا نہیں ہے ان کی رگوں کی پیاس بجھ چکی ہے البتہ ہوس باقی ہے ایک اور صاحب "جیبیں بھی جنہیں کچھ بڑبڑاتے
بھی جاتے ہیں" شاید اس دنیا میں ان کا کوئی رفیق نہیں ان کا بدن میلے میں ہے مگر ان کی روح کہیں اور ہے وہ ہم سے
پوچھتے ہیں انسانوں میں عام طور سے کتنا فاصلہ ہوتا ہے" ایک صاحب اپنے چھوٹے سے لڑکے کی انگلی پکڑے اس سے باتیں
کرتے چلے آتے ہیں ہر بات میں اماں کا نام آتا ہے ہمیں یہ دیکھ کر بڑی تسکین ہوتی ہے کہ ان کی نگاہ میں پاکیزہ عورت
میں الوہیت کا جلوہ دیکھتے ہیں مگر وہ ہمیں دوسری نگاہ میں اپنا راز سنا دیتے ہیں میں دماغی طور پر ناکارہ ہوں آپ
جسے میرا کارنامہ سمجھ رہے ہیں وہ میرا تکملہ کلام ہے اور بس" ایک صاحب اپنی بچی کے دونوں ہاتھ زور سے پکڑے ہیں
کلائیاں دکھی جاتی ہیں کوئی چوڑیاں نہ اتار لے" ہمیں ان کی حماقت اور ظلم دونوں پہ پیار آتا ہے مگر وہ آنکھ کے
اشارے سے ہمیں چوکنا کر دیتے ہیں دل کہتا ہے کہ یہاں ہر بات غیر یقینی ہے غنیم گھات میں ہے" خدا جانے ہم کہاں ہیں؟

لیجئے ایک اور صاحب کھٹ سے پیسہ تنبولی کی دکان پر پھینکا معلوم ہوا کہ آپ بڑے تونگر ہیں پیسے دو پیسے
کی آپ کے آگے کیا اصل ہے" ہمیں یہ گوارا نہیں کہ مفلسی میں حوصلوں کا اظہار کیا جائے۔ بلبلے پیدا کرنا اور انھیں توڑ ڈالنا انسانی لہو
کا شعلہ نہیں ہمیں ان لوگوں کے حوصلوں پر ہنسی آتی ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ انسان کی عظمت اس کی جیب میں ہے ہم
ابھی اس خاکے کو آنکھ بھر کر بھی نہیں دیکھ پائے کہ وہ زور سے پکار اٹھتا ہے "یہاں کوئی خوشی سچی خوشی نہیں کوئی حوصلہ
بھی سچا حوصلہ نہیں یہاں خوشیاں بکتی ہیں کوئی مہنگی ہوتی ہے اور کوئی سستی میری جیب میں ہر جمعہ کی شام کو
ایک ہی پیسہ ہوتا ہے اور میں ایک مہینہ میں بڑے اطمینان سے چار خوشیاں خرید سکتا ہوں بھلا اس میں آپ کو
کیا اعتراض ہے" اب ہم بہت کچھ دیکھ چکے اور اس میلے کو دیکھ کر تو طبیعت اور بھی سیر ہو گئی ہمیں کھلی ہوا میں نکلنے کا شوق
تھا وہ بھی پورا ہو گیا ہماری ملاقات ان سے بھی ہو گئی جنھیں عوام کہتے ہیں ان کی زندگی اس زندگی کے امکانات ان کے

روح و بدن کی گرمی، ان کی ہوس پرستی، ان کی داغی اور جسمانی مجبوریاں، ہرات میں ان کی بے یقینی، ہر انجمن میں ان کی تنہائی، ان کے حوصلے اور ان کی پسپائیاں بھی دیکھ لیں یہ سب سفید پوش ہیں مگر سفید پوشی اس کا زرہ بکتر ہے یہ سب لذت پرست ہیں اور لذت پرستی ان کا نعرۂ جنگ ہے دونوں روایتی ہیں مگر دونوں زندگی کو ایک سمت دیتے ہیں اور دونوں ان کی مخصوص زندگی کا ثبوت ہیں۔

یہ زندگی کتنی غیر محفوظ ہے کس قدر غیر یقینی ہے اور پھر کتنی محدود ہے کوئی ایسا بھی ہے جس کے لیے یہ زندگی محفوظ ہو یقینی ہو اور اتنی محدود بھی نہ ہو، شاید کوئی بھی نہیں، تو پھر کوئی ایسا ہو جو زندگی اور موت دونوں کی تاب لا سکے زندگی کی نہ سہی موت کی سہی جس کے بدن میں شیطان ہو اپنے بلند معنی میں نہ سہی پست معنی ہی میں سہی کوئی ہو کیسے ہی ہو مگر کوئی ایسا ہو جو ان حدود کو نہ مانے ان زنجیروں کو توڑ دے جو وار کر سکے وار الٹا پڑے کوئی مضائقہ نہیں گر جائے بلا سے گر جائے مگر جست لگا سکے، دوڑ تو سکے اس کی کوئی سمت ہو یا نہ ہو۔

رسوا کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا وہ اپنے قاری کو عام طور سے مایوس نہیں کرتے ان کے سینے میں وہ کشادگی نہ سہی جو سفید ریش بالزک کے حصہ میں آئی ہے مگر ان میں وہ سچائی ضرور ہے تو پھر وہ شخص کہاں ہے ہم جس کے متلاشی ہیں آیئے وہاں چلیں جہاں امراؤ جان شکار زندہ کی گھات میں ہیں، اب یہ سطریں ملاحظہ کیجیے جو یہاں وہاں سے لی گئی ہیں "ایک صاحب جن کی وضع شہر کے بانکوں ایسی تھی سانولا رنگ چھریرا بدن ایک دوشالہ کمر سے لپیٹے اور ایک سر سے باندھے میرے کمرے میں دراتے چلے آئے اور آتے کے ساتھ ہی قالین پر بیٹھ گئے کسی قدر بے تکلفی کے ساتھ بوا حسینی کا ہاتھ پکڑ لیا...... بوا حسینی نے گود پھیلائی انھوں نے جھن سے روپے پھینک دئے وہ صاحب میرے ہی کمرے میں تمام شب باش ہوئے کوئی پہر رات باقی ہوگی کہ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے کمرے کے نیچے آکر دستک دی وہ صاحب فوراً اٹھ بیٹھے اور کہا تو اب میں جاتا ہوں۔ . . ان صاحب کا نام فیض علی تھا پہر ڈیڑھ پہر رات گئے آتے تھے اور کبھی آدھی رات کو اور کبھی پچھلے پہر اٹھ کے جاتے تھے۔ مہینے ڈیڑھ مہینے میں کئی مرتبہ دستک یا سیٹی کی آواز میں نے سنی اور فوراً ہی فیض علی اٹھ کر روانہ ہو گئے ۔ . فیض علی کو مجھ سے بہت محبت تھی ۔ اگر میرا دل ابتدا سے گوہر مرزا کی طرف مائل نہ ہو گیا ہوتا تو میں ضرور فیض علی سے محبت کرتی اور اسی کو دل دیتی.... اس کو روپے پیسے کی کوئی پروا نہ تھی ایسا لا پالک آدمی میں نے رئیسوں میں دیکھا نہ شہزادوں میں..... "

اب یہ سطریں ملاحظہ ہوں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ میاں فیضو بندھے چلے آتے ہیں منہ پر دوپٹا ڈالے ہوئے، ان کی صورت دکھائی نہیں دیتی دوپہر سے پہلے کا واقعہ ہے۔۔۔ حسب معمول فیض علی کوئی پہر رات گئے تشریف لائے۔ آتے ہی کہا آج ہم باہر جاتے ہیں۔۔ پرسوں ضرور آئیں گے، اچھا یہ کہو کہ ہمارے ساتھ تھوڑے دنوں کے لیے باہر چل سکتی ہو۔۔۔ فیض علی نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا تھا کہ اگر میں اپنے اختیار میں ہوتی تو مجھے ان کے ساتھ جانے میں کوئی بھی عذر نہ ہوتا۔ بوا حسینی نے آکر صاف جواب دیا، ان کا باہر جانا کسی طرح نہیں ہو سکتا۔"

فیض علی: "دوگنی تنخواہ پر سہی۔"

بوا حسینی "چوگنی تنخواہ پر بھی ممکن نہیں ہم لوگ باہر نہیں جانے دیتے"

فیض علی "خیر جانے دو"

بوا حسینی چلی گئیں مگر میں نے دیکھا کہ فیض علی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے، میں نے دل میں ٹھان لیا کہ اس شخص کا ضرور ساتھ دوں گی،

میں۔ "اچھا تو میں چلوں گی"

فیض علی "اچھا چلو گی!"

میں۔ "ہاں کوئی جانے دے یا نہ جانے دے میں ضرور چلوں گی"۔

فیض علی: "دیکھو دغا نہ دینا ورنہ اچھا نہ ہو گا!"

ان سطروں میں فیضو کے خط و خال ہی نہیں اس کی شخصیت کے وہ تمام پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں جن میں چونکا دینے والی بات ہے امراؤ جان کی خلوت میں وہ اس انداز سے آتا ہے گویا اس نے ابھی کوئی معرکہ سر کیا ہے اور اس میں اتنی قوت ہے کہ جہاں پاؤں رکھ دے گا وہاں کی زمین پگھل کر موم ہو جائے گی ہم اس کے تیور دیکھتے ہی کہہ اٹھتے ہیں کہ سورما اور قلعے جیتنے کے لیے ہیں۔ وہ زندہ لاوا ہے وہ تا تر رشیدہ بھی ہے مگر یہی اس کی طاقت کا راز ہے وہ اخلاق کی کمزوریوں سے آشنا نہیں البتہ اس کے زعافات پر اسے پورا عبور ہے وہ آپ ہی اپنی زمین اور آپ ہی اپنا مطلع ہے اس کی شریعت اس کے خون میں ہے اس کے لہجہ میں تندی اور اس کی زبان میں تلوار کی سی کاٹ ہے اس میں چھا جانے اور اپنی بات منوانے کی امنگ ہے وہ کنواری زمین سے فصل اگا سکتا ہے اور جیتی جاگتی آبادیوں کو بے دردی کے ساتھ پامال کر سکتا ہے جس

تو امراؤ جان پہا اٹھتی ہے کہ ایسا دل چالاک آدمی رئیسوں میں دیکھا نہ شہزادوں میں وہ اپنے جنازے پر ہنسنے کے لیے تیار ہے مگر عبرت حاصل کرنے کے لیے تیار نہیں، وہ سب کچھ ہو سکتا ہے مگر مجاور نہیں ہو سکتا اس نے کوئی چیز ورثہ میں نہیں پائی اس میں اپنی قوت ہے اسی لیے چھپتا ہے اور چھن سے پھینک دیتا ہے وہ نچلا نہیں بیٹھ سکتا اس میں کوئی ایسی بات ہے جو دوپہر کی دھوپ میں ہوتی ہے اور پھر بھی اس میں وہ نمک ہے جس پر امراؤ جان سے نے کو نیا رہی خانم کے گاہکوں میں یہ نمک کہاں کہیں تاروں کی چھاؤں میں: ہماہمی اور بانی کے ہلبلوں میں جوں کی تلملاہٹ ہوتی ہے، سا میں یہ گھن گرج کہاں؟ "ہم پرسوں آئیں گے پرسوں ضرور آئیں گے۔ تھوڑے دنوں کے لیے باہر چل سکتی ہو" دیکھو دغا نہ دینا ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ اس لہجہ میں گھلاوٹ نہیں مگر کوئی گہری منطق ہے اس میں شیطان بولتا ہے جب ہی تو ایک رچی ہوئی طوائف کی رگوں میں زلزلہ آ جاتا ہے اور وہ تھکے ہوئے پرندوں کی طرح گردن جھکا دیتی ہے اس تندی کے باوجود اس کے دل میں گرمی بھی ہے وہ دشمن سے بڑی بڑی قیمت وصول کرتا ہے مگر دوستی کی سرقیمت ادا کرنے کے لیے تیار رہتا ہے وہ گرم جوشی سے ہاتھ ہی نہیں دباتا اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بھی گرنے لگتے ہیں وہ ہیرے لٹا سکتا ہے مگر ایک دوست کی نشانی کسی کو نہیں دے سکتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آوارہ گرد اس کا حکم مانتے ہیں کوتوال اسے جھٹکے سے چھوڑ دیتا ہے جلاد اس کے کام آتی ہے فضل علی اس پر جان چھڑکتا ہے امراؤ جان اس پر مرتی ہے مگر حاصل یہ ہے کہ وہ جلال الدین شاہ خوارزم نہیں، رہزن ہے وہ زندہ ہے مگر تباہ کن ہے وہ عظیم ہے مگر گمراہ ہے ہم اس کے سایے میں پناہ لے سکتے ہیں مگر اس کے سایہ کا اعتبار نہیں، وہ اپنے دور سے میل نہیں کھاتا مگر اس میں آگے دیکھنے کی صلاحیت بالکل نہیں وہ معرکہ کا قائل ہے مفاہمت کا قائل نہیں وہ غدر کر سکتا ہے انقلاب نہیں کر سکتا بہرحال رسوا نے ہمیں مایوس نہیں کیا اور ہم آہستہ آہستہ اس خاص زمانہ میں پہنچ گئے جب غدر کی آگ نے ملک کے گوشہ گوشہ کو ڈھانپ لیا ہے مگر اس آگ کے پھیلنے سے پہلے کئی باتیں ہو چکی ہیں امراؤ جان خانم کے اقتدار سے بیزار ہو کر فیضو کے ساتھ نکل بھاگتی ہے۔ راستہ میں راجہ دھیان سنگھ کے آدمی تانگہ گھیر لیتے ہیں ان سے معرکہ ہوتا ہے یہ معرکہ سنسنی خیز ہے اور مصنوعی سا معلوم ہوتا ہے شاید اس لیے کہ امراؤ جان جو کچھ دیکھتی ہے سنولائے ہوئے گنوار اور سلگتے ہوئے توڑے پردے کے اندر سے جھانک کر دیکھتی ہے راجہ صاحب کے محلات میں ہماری ملاقات خورشید جان سے بھی ہو جاتی ہے امراؤ جان کو اس کے دماغی سکون پر حیرت بھی ہوتی ہے اور خوشی بھی حیرت اس لیے کہ لکھنؤ کی رنگینی دیہات میں کیونکر رہ سکتی ہے اور خوشی اس لیے کہ یہاں اس کا بدن کم از کم خانم کی ستم ظریفیوں سے

قطعاً محفوظ ہے یہاں یہ راز بھی ہم پر کھل جاتا ہے کہ خورشید جان عیش باغ سے یک بیک کیسے غائب ہو گئی اس واقعہ سے اُس زمانہ کی سیاست کا بھرم بھی کھل جاتا ہے اور ہمیں اس روشنی میں ریاست کے کل پرزوں کو دیکھنے کا موقعہ ملتا ہے۔ دھیان سنگھ ایک طرف تو سرکاری حکم کی تعمیل کرتے ہیں، ڈاکوؤں پر چھاپا مارتے اور انھیں لکھنؤ بھیج دیتے ہیں دوسری طرف فاتم سے لاگ ڈانٹ رکھتے ہیں اور اپنے آدمی اِدھر اُدھر لگائے رہتے ہیں کہ موقعہ پاتے ہی خورشید جان کو اڑا لائیں۔ طاقت کا استعمال یا تو اس لیے ہوتا ہے کہ جاہ و منزلت میں اضافہ ہو یا اس لیے کہ ہوا و ہوس تسکین پائیں دھیان سنگھ نواب وزیر کے ساتھ وہی برتاؤ کرتا ہے جو نواب وزیر شاہانِ دہلی کے ساتھ کرتے ہیں، قوی دیکھتے ہیں تو حکم بجا لاتے ہیں، موقعہ پاتے ہیں تو سند مانگتے ہیں، وقت آتا ہے تو اپنا سکّہ چلاتے ہیں۔ کوئی مرکز نہیں، کوئی قانون نہیں کوئی تدبر نہیں کوئی دوست نہیں کوئی دشمن نہیں کوئی اصول نہیں کوئی روایت نہیں، طوائف الملوکی ہے جو ہوتا ہے ہو رہتا ہے جو بنتا ہے بگڑ جاتا ہے خاندان تباہ ہوئے جاتے ہیں وزرا انگریزوں کے اشارے سے سازشیں کرتے ہیں انگریز طبیب دواؤں میں زہر ملانے کے موقعے تلاش کرتے ہیں، نواب زنان خانے کی گرد ہو کر رہ گئے ہیں، طوائفیں، ڈومنیاں اور بیسواں رات دن یلغار کرتی ہیں ہر محل ایک کمین گاہ ہے جھاڑیوں میں ڈاکو چھپے ہوئے ہیں عوام بے دست و پا ہیں تہ خانوں میں بگلے اور دیوان خانوں میں مرغ ناچتے ہیں، خانقاہوں کے چراغ گل ہو چکے ہیں، شاہ ولی اللہ کے مدرسہ میں جنوں کے آثار باقی نہیں۔ مردوں کو رو چکے جو زندہ ہیں بنے اپنے داغ دھوتے ہیں، سب میں لگے ہوئے ہیں قرآن جزدان میں زمین آسمان پر ہے آدم کہیں نہیں ہے خدا ہم تلاش آدمے ہست، فیض علی اور نانا فرنویس جان پر کھیلنا جانتے ہیں اور عمل کر سکتے ہیں مگر سلیقے سے محروم ہیں۔ غدر ہوتا ہی ہو جاتا ہے آگ بھڑکتی ہے دب جاتی ہے عالم کوتہ نشین ہو جاتی ہیں کون عالم؟ در ہر دو کا زندہ اصول ہے؟ اس معاشرت کی روح زوال تھا اس جلوس کی آخری منزل بھی قیامت سی قیامت ہے۔

دیکھتے دیکھتے عظمت کے ستاروں کے نشاں ٭ ہو گئے آنکھ سے ہم بعد میں پنہاں

ہائے وہ جاہ و حشم ہم نہ ہو اُنکی حسرت تو رہ جاتی لیکن ٭ اب انھیں ڈھونڈنے ہم جائیں کہاں

امراؤ جان کانپور روانہ ہوتی ہے کان پور میں فیض علی گرفتار ہو جاتے ہیں نواب سلطان کے یہاں مجرا ہوتا ہے وہ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں ان کی بیگم سے تفصیلی ملاقات ہوتی ہے بیگم صاحب کا نام کسی زمانہ میں رام دئی تھا یہ وہی ہیں جو قصہ کی ابتدا میں ایک جھلک دکھا کر غائب ہو جاتی ہیں، دونوں کو گرفتار کیے جانے سے پہلے ایک کال کوٹھری میں انھوں نے اپنی

زندگی کی سب سے بھیانک رات ساتھ ساتھ گذاری تھی اسی لیے روحانی طور پر ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں زمانہ کی گردش اور بے یقینی دیکھیے اور دونوں کا مقابلہ کیجیے، ایک وہاں ہے جہاں دن کے سوا رات نہیں ہوتی اور ایک وہاں ہے جہاں دن اور رات میں کوئی فرق نہیں، دونوں اپنے آغاز کے اعتبار سے ایک ہیں مگر اپنے انجام کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہیں، ایک بیوی ہے دوسری طوائف، ایک روح و بدن کی پاکیوں کا سجوگ ہے اور دوسری روح و بدن کا واسوختہ ہے، ایک سلطان پر جان دیتی ہے اور نہیں پاتی دوسری ابرو کے اشارے سے میدان مار لیتی ہے، عقیدے کے لحاظ سے ایک کے لیے سلگتی ہوئی آگ ٹھنڈی پڑ جاتی ہے اور دوسری جہاں پاؤں رکھتی ہے شعلے جاگنے لگتے ہیں، دونوں نے زندگی کی پہلی رات ایک ساتھ گذاری تھی دونوں کہانی کے خاتمے سے ذرا پہلے ایک دوسرے سے ملتی ہیں اس طرح آغاز اور انجام ایک دائرے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور پلاٹ ناول کی زمین سے ابھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے، سڈول متناسب اور موزوں، درمیان میں واقعات کی ایک زنجیر سی بن جاتی ہے جس میں موضوع اور ساخت دست و گریباں نظر آتے ہیں اور جس کی بدولت قاری کو جمالیاتی تسکین حاصل ہو جاتی ہے، تصور میں جو خطوط ایک دوسرے سے مل کر دائرہ بناتے ہیں ان میں سے دو ایک میں کجی ہے، مشاعرہ ضرورت سے زیادہ طویل ہے، نواب چھبن بہت عرصہ کے بعد دریافت ہوتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسوا نے واقعات کی مجبوری سے انھیں گومتی میں ڈبو دیا تھا اور اب پلاٹ کی ضرورت سے ابھارا ہے، فیض علی اور دھنا سنگھ کا معرکہ ضروری تھا وہ ایک منطقی اور ناگزیر کڑی ہے مگر وہ مصنوعی ہے اور میلو ڈرامائی بھی ہے، آخر میں گو دلاور خاں کی گرفتاری ایسی کھٹکتی نہیں مگر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کی گرفتاری دراصل شاعرانہ انصاف کا ادنیٰ تقاضہ ہے، بعد میں امراؤ جان نے ایک ضمیمہ دیا ہے جو کچھ تو پلاٹ کی ضرورت سے لایا گیا ہے تاکہ [illegible] ہوئے دکھا دیے جائیں اور رفتہ رفتہ ناول کے آخری حدود نظروں سے اوجھل ہو جائیں اور کچھ اس لیے کہ زمانہ ناول نگار سے ایک خاص قسم کے اخلاق کی توقع رکھتا تھا اور اپنے پچھلے گناہوں کی تلافی کے لیے پند و موعظت کو ضروری خیال کرتا تھا مگر واقعہ یہ ہے کہ اس وعظ کو ہم ناول کے دائرہ سے باہر سمجھتے ہیں، ناول تو دلاور خاں کی موت پر ختم ہو جاتا ہے اسے ناول کا تتمہ نہیں ضمیمہ کہہ سکتے ہیں۔

حسن تعمیر کی یہ بحث کہاں آنی چاہیے تھی اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں، یہ بحث ضروری تھی اور ہماری رائے میں اسے وہیں آنا چاہیے تھا جہاں پلاٹ ایک دائرہ کی صورت میں ابھرتا ہوا نظر آئے پھر یہ ممکن نہیں کہ ہم ان خامیوں کو بھول جائیں جو اس دائرہ کے حسن اور ہماری جمالیاتی تسکین میں خلل انداز ہوتی ہیں، یہ منطق فطری ہے اسی نے ہمیں گریز کرنے پر آمادہ

ورنہ ہم کان پور ہوتے ہوئے فیض آباد جاتے جہاں ایک بڑی حویلی کی ڈیوڑھی میں دو بوڑھی عورتیں گلے مل مل کر رو دیتی ہیں اور صبح کو وہ نوجوان امراؤ جان کے سینے میں خنجر اتارنے کے لیے آتا ہے جسے اس نے اپنی گودوں میں کھلایا تھا۔ فیض آباد سے ہمیں لکھنؤ جانا تھا۔ ہم لکھنؤ جاتے اور واقعات کے تسلسل اور بہاؤ کا ساتھ دینے کے لیے ہمیں جانا بھی وہیں چاہیے کیونکہ اب ناول اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے چنانچہ ہم اس وقت وہیں ہیں

غدر ہو چکا ہے جھلملاتے ہوئے ستارے ایک ایک کرکے بجھ گئے ہیں وہ لکھنؤ جو بادۂ شبانہ کی سرمستیوں میں ڈوبا ہوا تھا خاصہ بدل گیا ہے آخر وہ تبدیلی کیا ہے اور کس نوعیت کی ہے جو واقع ہو چکی ہے ہمارا مطالبہ کیا ہے اور فنکار اسے اپنے عہد میں اور اگر ما ہے یا نہیں؟ دیکھنا یہ ہے کہ رسوا واقعے کا ساں کرتے اور سب روش ہو جاتے ہیں یا واقعیت کے چہرہ سے پردہ ہٹا کر ہمیں سچی لکیں ہم سمجھاتے ہیں دوسرے الفاظ میں وہ ہنگامے کی تاریخ پیش کرتے ہیں یا وہ تاثرات جو نتیجہ ہیں ناگزیر ہیں اور ناظر کے دل و دماغ پر وارد ہوتے ہیں رسوا دوسرا طریقہ کار اختیار کرنے میں کیونکہ وہ غدر کے لیے زمین ہموار کر چکے تھے ہمیں یقین تھا کہ یہ سارا ساز و سامان کوئی دم میں بکھرنے والا ہے دوسرے ان کی تصویر مختصر پلاٹ پر ہے اس میں تانا فرانسیس کے معرکے ریزیڈنسی کی سپاہی داخل در کی سخت جانی دکھانے کی گنجائش نہیں تیسرے اس کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ یہ ان کے دائرہ عمل سے باہر ہی ہیں جن لوگوں سے واقفیت ہے انھیں ہم معرکہ میں کب دیکھ سکتے ہیں اُن پر تو کچھ گذر رہی سکتی ہے وہ کسی المیہ کے موضوع نہیں بن سکے کیونکہ ان میں خطرہ مول لینے کی ہمت نہیں ہاں وہ خطرے سے دوچار ہو سکتے ہیں رسوا یہاں پھر اپنی مہارت کا ثبوت دیتے ہیں جو باتیں ہم پوچھنا چاہتے ہیں ان کا جواب ایک ایک کرکے ہمیں ان کے مخصوص منطقی شاعرانہ انداز میں مل جاتا ہے (۱) غدر کے بعد لکھنؤ اور وہ لوگ کیا ہوئے جو ان در و دیوار کے پروردگار تھے (۲) خانم کس حال میں ہیں وہی جو اس دور کا زندہ اصول تھیں (۳) بوا حسینی کہاں ہیں وہی جن کے دم سے قدم قدم پر بہار تھی (۴) امراؤ جان کے سینہ میں دل دھڑکتا ہے وہ کونوں میں جھانکتی ہے؟ اسے بیتے ہوئے دن یاد آتے ہیں یا نہیں؟

طوالت سے بچنے کے لیے ہم ذیل میں چند سطریں نقل کیے دیتے ہیں وہ ہمارے سوالات کا جواب اور رسوا کی فنی بصیرت کا ثبوت ہیں آخری سوال کو دماغ میں محفوظ رکھنا چاہیے کیونکہ ماضی کا تبصرہ ناول میں ایک سمت کا حکم رکھتا ہے

اب یہ سطریں ملاحظہ ہوں "لکھنؤ میں آکر خانم کے مکان میں اتری، وہی چوک وہی کمرہ وہی ہم ہیں اگلے آنے والوں میں سے کچھ لوگ تو کلکتہ چلے گئے تھے کچھ اور شہروں میں نکل گئے تھے شہر میں نیا انتظام نئے قانون جاری تھے

"آصف الدولہ کے امام باڑے میں قلعہ تھا چاروں طرف دمدمے بنے ہوئے تھے جابجا چوڑی سڑکیں نکل رہی تھیں گلیوں میں کھڑنجے بنائے جاتے تھے نالے نالیاں صاف کی جاتی تھیں غرضکہ لکھنؤ اب اور ہی کچھ ہو گیا تھا۔

"آصف الدولہ کے امام باڑے میں قلعہ تھا۔ چاروں طرف دمدمے بنے ہوئے تھے" ظاہری شکل و صورت میں اس سے بڑا انقلاب اور کیا ہو سکتا تھا۔ یہ ہمارے پہلے سوال کا جواب ہے۔

"زمانہ کے انقلاب کے ساتھ خانم کی طبیعت بھی کچھ بدل گئی تھی مزاج میں ایک قسم کی بے پروائی سی ہو گئی تھی جو رنڈیاں نکل کر علیحدہ ہو گئی تھیں ان کا تو ذکر کیا جو ساتھ رہتی تھیں ان کے روپیہ پیسہ سے کچھ واسطہ و غرض نہ تھی بہرحال

ع:۔ ان کو عبرت تو ہوئی غیر کے مر جانے سے

"رنڈیاں نکل کے علیحدہ ہو گئی تھیں" اس کی تفصیل آگے چل کر ملتی ہے۔ ایک سلونی شام کو۔ سب امراؤ جان کے کمرہ میں جمع ہوتی ہیں ان میں خورشید جان بھی ہے جس کی موجودگی اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ غالباً راسہ دھیان سنگھ بھی غدر میں کام آ گئے یہ مجمع کچھ ایسی چابکدستی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ اسے دیکھتے ہی ہمارے دماغ کی بہت سی نسیں بیدار ہو جاتی ہیں یہ ایک زخم کا مسکرانا ہے غدر کے ہنگامے کے بعد ان سب کا بہم ہونا ایک خوشگوار اتفاق ہے جس میں سب کی عبرت ہے یہ بجائے خود بھولی بسری یادیں ہیں جنھیں دیکھتے ہی ہم خواب و خیال کے عالم میں پہنچ جاتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے شعور کا شش پانی میں ڈوب گئی ہے اگلی صحبتیں اور پرانی چوٹیں غیر ارادی طور پر ایک ایک کر کے ابھر آتی ہیں۔ سب ایک دوسرے سے ملتی نہیں ایک معنی میں ماضی کی یادگار مناتی ہیں یہ مجمع ایک مرحوم معاشرت کی تلخیص ہے اور اس پر نازک تبصرہ بھی ہے جو منظر نگاری کی گئی ہے وہ انتہائی خیال انگیز ہے اور رسوا کے فن کو نمایاں کرتی ہے کیونکہ یہاں منظر مقصود بالذات نہیں ہے ہمارے اندرون میں ایک خاص دنیا پیدا کرتا ہے یا ہمیں کسی خاص فضا کے معنی و مفہوم سے آشنا کرتا ہے وہ ہمیں یا تو ایک نئے ماحول کے لیے تیار کرتا ہے یا بجائے خود ایک چھپی ہوئی تنقید ہوتا ہے وہ انسان سے آزاد نہیں مگر انسان اس کی مخلوق بھی نہیں ہاں انسان کی زندگی کو وسعت بخشتا ہے۔ اب یہ اقتباس دیکھئے۔

"گومتی پار پہنچ کر گانا شروع ہوا اس دن بیگا جان کا گانا جھولا کن ڈار دے امریاں کیا کیا۔ ماہیں لی کہ دل لیا جاتا تھا" آخری جملہ معنی خیز ہے اور جو کچھ پہلے کہا جا چکا ہے اس کی تائید کرتا ہے اب یہ سماں دیکھئے"۔

"گھنے درختوں کی آڑ میں ڈوبتا ہوا سبزہ پر سنہری کرنوں کے پڑنے سے عجیب کیفیت تھی جابجا جنگلی پھول کھلے ہوئے

سبزہ کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑ رہی تھیں سامنے جھیل کے پانی میں آفتاب کی شعاع سے وہ عالم نظر آتا تھا جیسے پگھلا ہوا سونا تھلک رہا ہو درختوں کے پتوں کی آڑ میں کرنیں اور ہی عالم دکھا رہی ہیں آسمان پر شفق پھولی ہوئی تھی اس وقت کا سماں ایسا نہ تھا کہ ایک خفقانی مزاج کی عورت جیسی کہ میں ہوں جلدی سے پھولداری میں چلی آتی تماشہ دیکھتے ہوئے خدا جانے کتنی دور نکل گئی"

یہ سورج کی آخری کرنیں ہیں یہ شام ایک پورے دور کی شام ہے یوں تو پگھلا ہوا سونا تھلک رہا ہے اور شفق بھی پھولی ہوئی ہے مگر ان کی اصلیت سراب سے زیادہ نہیں ان کی آن میں آسمان پر سرمئی بدلیاں اور جھیل کی صاف ستھری سطح پر سیاہی کی پرچھائیاں چھلاوے کی طرح ناچتی ہوئی نظر آئیں گی اور ہم بھی خدا جانے کتنی دور نکل جائیں گے اس وقت ہمارے دل میں کیا کیا خیال آئیں گے۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ ہم راستہ بھول جائیں ہمارے پاس قطب نما تو ہے نہیں ہم کس سے پوچھیں گے کہ کہاں جائیں؟ ظاہر ہے کہ ہم اس وقت ناول کے حدود میں ہوں گے اور ہم یہ بھولتے ہیں کہ ناول کی ابتدا میں امراؤ جان ہماری قیمت ادا کر چکی ہیں ہم ان کے ہاتھ بس بک چکے ہیں وہ جہاں کہیں لے جائیں گی ہمیں جانا ہوگا۔ ہمارے آخری سوال کا جواب اور ناول کا خاتمہ ہے اور نہیں وہ سمت جس کی ہمیں تلاش ہے سمت کا مفہوم واضح کرنے کی ضرورت نہیں اس کی وضاحت خود بخود ہو جائے گی یہاں اس سوال پر بات چیت کرنے کی گنجائش بھی نہیں ہے کہ ہیرو کیا ہوتا ہے اور اس ناول میں کوئی ہیرو ہے یا نہیں اور اگر نہیں ہے تو کیوں؟ یہاں ہم ناول کا ایک انتہائی خوبصورت ٹکڑا نقل کرتے ہیں اس کا سرا ہاتھ آ جائے تو کئی باتیں آپ ہی آپ سلجھ جائیں وہ کوئی پہیلی نہیں ہے بیداری کا خواب ہے اور رسوا نے اسے ایک ایسے موقع پر چسپاں کیا ہے کہ ہمیں ایک طرف ان کے منصب کی قدر و قیمت کا بے لاگ اندازہ ہو جاتا ہے اور دوسری طرف ہمارے دماغ پر اس کی ناگزیری اور اس کی شدت جمال کا بے پناہ اثر ہوتا ہے جزئیات کے انتخاب میں ان کے مشاہدے کی باریکی اپنی گواہ آپ ہے اور یہ ناول نگار کی آخری کامیابی ہے اس ٹکڑے میں الفاظ کی سادگی ان کی فطری روانی اور ان کے اختصار پر بھی نظر رکھنی چاہیے کیونکہ ہماری زبان میں غالباً وہی ایک ایسے ناول نگار ہیں جو کم سے کم الفاظ سے زیادہ سے زیادہ کام لیتے ہیں وہ فلابیر کے اس نکتہ کو پہچانتے ہیں کہ "ایک خیال ایک ہی صورت میں ادا ہو سکتا ہے" وہ ٹکڑا یہ ہے "جمعہ کو آدمی آیا کہ خانم کی طبیعت کچھ علیل ہے تمہیں یاد کرتی ہیں فوراً سوار ہو کے گئی انھیں دیکھ کر گھر واپس آنے کا ارادہ کیا جی میں آیا کہ ایک بھاری جوڑا نکالتی چلوں کمرہ کھولا، دیکھا کمرے میں جالا

طرف جالے لگے ہیں پلنگ پر منوں گرد پڑی ہے فرش فروش الٹا ہوا پڑا ہے، ادھر ادھر کوڑا پڑا ہے یہ حال دیکھ کر مجھے
اپنے اگلے دن یاد آئے۔ اللہ ایک دن وہ تھا کہ یہ کمرہ کیسا سجا سجایا رہتا تھا دن بھر میں چار مرتبہ جھاڑو ہوتی تھی، بچھونے
جھاڑے جاتے تھے گرد کا نام نہ تھا تنکا تک کہیں پڑا نہ رہتا تھا اب یہ حال ہے کہ دم بھر بیٹھنے کو جی نہیں چاہتا وہی پلنگ
جس پر میں سوتی تھی اب اس پر قدم رکھتے ہوئے کراہت معلوم ہوتی ہے۔ آدمی ساتھ تھا میں نے اس سے کہا ذرا جھاڑو تو
لے لے وہ ایک سینٹھا کہیں سے ڈھونڈ کر اٹھا لایا۔ جھاڑو دینے لگا اسی دیر میں میں نے اپنے ہاتھ سے دری الٹی آدمی نے
اور میں نے مل کر دری بچھائی، چاندنی کو ٹھیک کیا صحن فرش درست ہوگیا میں نے پلنگ کے بچھونے اٹھوا کر جھڑوائے کوٹھری
میں سے سنگاردان، پان دان، اگالدان اٹھا لائی سب چیزیں اپنے اپنے قرینے سے لگا دیں جس طرح کسی زمانہ میں لگی رہتی تھیں
خود پلنگ پر تکیہ لگا کے بیٹھی آدمی کے پاس خاصدان تھا پان لے کے کھایا آئینہ سامنے لگا کے منہ دیکھا اگلا زمانہ یاد آگیا
شباب کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی اس زمانہ کے قدردانوں کا تصور بندھ گیا گوہر مرزا کی شرارتیں، راشد علی کی حماقت،
فیضو کی محبت، سلطان صاحب کی مروت، غرضکہ جو جو صحبتیں اس کمرے میں ہوئے تھے مع اپنے اپنے خصوصیات کے پیش نظر
تھے وہ کمرہ اس وقت عالم خیال بن گیا تھا ایک تصویر آنکھ کے سامنے آتی تھی اور غائب ہو جاتی تھی پھر دوسری
سامنے آتی تھی جب کل تصویریں نظر سے گذر چکیں تو یہ دورہ از سر نو پھر شروع ہوا پھر وہی صورتیں ایک دوسرے کے
بعد پیش آئیں پہلے تو ایسے کئی دورے جلد جلد ہوئے اب ذرا توقف ہونے لگا اب مجھ کو ہر تصویر پر زیادہ غور و فکر کرنے
کا موقع ملا، جو واقعات جس شخص کے متعلق تھے ان پر نظر پڑنے لگی پہلے جب دماغ کو فکر ہوا تھا تو صرف چند تصویریں
نظر آئی تھیں اب ہر تصویر سے بہت سی نکلیں اور عالم خیال کی وسعت بڑھنے لگی تمام زندگی میں جو کچھ دیکھا سب نگاہ
کے سامنے تھا اس اثنا میں ایک مرتبہ سلطان صاحب کا پھر خیال آیا تو اس کے ساتھ ہی پہلے مجرے کا تمام جلسہ جس میں
سلطان صاحب کو دیکھا، اور دوسرے دن ان کے خدمت گار کا آنا پھر ان کا خود تشریف لانا، مرزا صاحب کی باتیں
شعر و سخن کا چرچا، خاں صاحب کا مخل صحبت ہونا، بدزبانی کرنا، سلطان کا تمنچہ مارنا، خاں صاحب کا گر پڑنا، تمیز خاں کی
جاں نثاری، کوتوال کا آنا، خانصاحب کا گھر پر بھجوانا، گر سلطان صاحب کا نہ آنا، محفل میں ان کو دیکھنا لڑکے کے ہاتھ
خط بھیجنا پھر از سر نو رسم ہونا، نواز گنج کے جلسے، یہ سب واقعات اس طرح سے معلوم ہوتے تھے جیسے کل ہوئے ہیں یہ دورے
چل رہے تھے مگر جب پہلے مجرے کے بعد سلطان صاحب کے آدمی کا پیام لے کر آنا یاد آتا تھا طبیعت کچھ رک سی جاتی

تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس موقعہ پر کچھ چھوٹ جاتا ہے۔ جب آدمی نے زور سے چیخ ماری۔ آدمی ہے۔ بیوی دیکھئے وہ کنکھجورا
آپ کے دوپٹہ پر چڑھا جاتا ہے۔ میں نے ادنیٰ کہہ کے جلدی سے دوپٹہ اتار کر پھینک دیا، الگ جا کھڑی ہوئی۔ آدمی نے دوپٹہ اٹھا کے
جھاڑا، کنکھجورا پٹ سے گرا اور رینگ کے پلنگ کے سرہانے پائے کے بیچ گھس گیا۔ آدمی نے پلنگ کا پایا اٹھایا۔ اب جو دیکھتے ہیں تو پائے
کے نیچے پانچ اشرفیاں برابر برابر رکھی ہوئی ہیں" یہ خاصا طویل اقتباس ہے اس میں غدر کے اثرات جس خوبی کے ساتھ دکھائے گئے ہیں
اس پر نقد کی ضرورت نہیں۔ یہی کمرہ ہے جس کے سارے ساز و سامان کی جزئیات پر رسوا نے ٹھہر ٹھہر کر روشنی ڈالی تھی۔ بار بار ہمیں اس کی
طرف متوجہ کیا تھا۔ یہی کمرہ ماضی کا ترجمان اور اس کا ملجا و ماویٰ تھا۔ یہی اس کا مکتب تھا اور یہی اس کی منزل۔ اب یہاں نہ جلتی
آئینے ہیں، نہ فانوس ہیں، نہ چھت گیریاں ہیں، فرش الٹے پڑے ہیں، کونوں میں جالے لگ گئے ہیں، پلنگ گرد سے اٹے ہوئے ہیں۔
کوئی قافلہ ادھر سے گذرا ہے جس کے نقش در و دیوار پر ابھرے رہ گئے ہیں۔ یہ حال ہے جس کا ماضی وہ تھا۔ "مرگ مجنوں پہ عقل گم ہے میر
کیا دوانے نے موت پائی ہے" اس ساز و سامان پر مردنی چھائی ہوئی ہے مگر اس کے مشاہدہ سے حافظہ پر چوٹ پڑتی ہے
اور اس کے جاگتے ہی یہ سارا سامان جگمگا اٹھتا ہے اور اس کے متعلقات ایک ایک کر کے نظر کے سامنے آنے لگتے ہیں البتہ
یہ سب بکھرے ہوئے ہیں۔ ماضی کی زندہ تصویر بنانے، اس کا سچا نقش ابھارنے کے لیے انھیں ترتیب دینا، پرانے انداز پر سجانا
اور سنوارنا، آئینے میں اپنے خط و خال دیکھنا اور عمر رفتہ کو آواز دینا ضروری ہے۔ یہی سارا عمل ہے اور رسوا اسے کمال فن کے ساتھ
پورا کرتے ہیں۔ امراؤ جان اس نگار خانے کو ماضی کی آرسی دکھاتی اور اگلے انداز پر سجاتی ہیں۔ وہ آئینہ میں اپنی صورت دیکھتی
اور اپنے چہرے کے ان سوئے ہوئے خطوط کو جگاتی ہیں جو ماضی کے جلووں سے نسبت رکھتے تھے۔ یہ عمل ایک ذہنی ہنگامہ ہے جو
یک بیک انھیں حال سے نکال کر ماضی میں پھینک دیتا ہے۔ اب ماضی زندہ ہے۔ اس کی آنکھ میں سرخ ڈورے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ
انگڑائی لیتا ہے۔ امراؤ جان کے رگ و ریشے میں اس کے حسن اور ہیبت کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے اور تقریباً چالیس سکنڈ کے لیے
وہ کرخت نکیلی اور سایے میں ڈھلی ہوئی چیز جسے ہم شعور کہتے ہیں کسی میالی ملگجی جھیل میں ڈوب جاتی ہے۔ جس طرح جھیل
میں کنکر پھینکنے سے لہریں پیدا ہوتی ہیں، دائرے بنتے، ابھرتے، ملتے اور مٹ جاتے ہیں اسی طرح امراؤ جان کے لاشعور میں ایک
ہلکی پھلکی قیامت بپا ہوتی ہے، بل کھاتی اور بسر جاتی ہے۔ تصویریں نمودار ہوتی، ایک ایک کر کے رقص کرتی، اپنے نازموں کی نہر پر پگھلتی ملتی
فانوس کی طرح گردش کرتی اور اپنا اپنا حساب دے کر پھر کسی برزخ میں چلی جاتی ہیں۔ یہ سب کچھ تقریباً چالیس سکنڈ میں پورا ہو جاتا ہے۔ آدمی
چیختا ہے: بیوی دیکھئے وہ کنکھجورا آپ کے دوپٹے پر چڑھا جاتا ہے۔ شعور پلٹ آتا ہے اور وقت اپنی پرانی رفتار کے ساتھ بہہ نکلتا ہے ...

محسوس ہوا یا نہیں کہ امراؤ جان ماضی کی ایک ایک تصویر کو بار بار چومتی تھیں اور ان کا آدھا وقت محض ایک تصویر پر صرف ہ
ہے یہ تصویر نواب سلطان کی ہے جن کی ملاقات، مذاق، ملازم، مکتوب محبت اور معرکہ کے بہت مختصر مگر شوخ و تنگ خاکے ان کے
میں ابھرتے ہیں۔ ماضی نے خاکے ہیں مگر نواب سلطان ابھی زندہ ہیں رسوا کی زبان میں ان کا ماضی یہ ہے" نواب صاحب بہت ہی کم سخن
بھولے آدمی تھے سن اٹھارہ انیس برس کا تھا، دیہاکے جعل فریب بالکل آگاہ نہ تھے نواب صاحب کی صورت ایسی نہ تھی
کہ ایک عورت خواہ وہ کیسی ہی سخت دل کی کیوں نہ ہو ان پر مائل نہ ہو جائے بڑی بڑی آنکھیں بھرے بھرے بازو، مچھلیاں ا
پٹسی ہوئیں، چوڑی کلائیاں بلند و بالا کسرتی بدن" نواب۔ "تو کہیے آپ شعر بھی کہتی ہیں"

میں۔ "جی نہیں آپ جیسے قدر دانوں سے کہواتی ہوں"

"اس بات پر نواب صاحب پہلے تو ایک ذرا پیچ آجبیں ہوئے پھر مجھے مسکراتے دیکھ کر ہنس پڑے"

نواب۔ "اکثر ایسے صاحب ہیں جنھوں نے کبھی ایک مصرعہ نہیں کہا اور ہر مشاعرے میں غزل پڑھنے کو مستعد... جھوٹی تع
سے دل کو کیا خوشی ہوتی ہوگی ... " اتنے میں کمرے کا دروازہ دھڑاک سے کھلا اور ایک صاحب پچاس پچپن برس کا
سیاہ رنگت، بڑھی ڈاڑھی، ترچھی پگڑی باندھے کمر بندھی ہوئی، کٹار لگی ہوئی کمرے کے اندر گھس آئے اور آتے ہی نہایت
بے تکلفی سے میرا زانو دبا کر بیٹھ گئے نواب صاحب نے میری طرف دیکھا .. میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا تو اس نگوڑے مارے نے
سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اب کیا کروں ..."

نواب۔ "خان صاحب رنڈی کا ہاتھ چھوڑ دیجئے" اسی میں خیریت ہے آپ بہت کچھ زیادتی کر چکے ہیں"

خان صاحب۔ (قہقہہ مار کے) صاحبزادے ابھی تم خود منہ چومنے کے لائق ہو اور مردوں سے خانہ جنگی کرنے کا حوصلہ، کہیں چرکہ
جاؤ گے۔ تو امراؤ جان روتی پھریں گی۔ "

نواب نے دلائی کے اندر سے ہاتھ نکالا ہاتھ میں طپنچہ تھا دن سے داغ دیا، خاں صاحب دھم سے گر پڑے، میں سن
ہوگئی، فرش پر خون ہی خون نظر آتا تھا۔ ..

نواب۔ "میں نہیں جانتا اب جو کچھ ہوا، ہوا، اور جو کچھ ہونا ہوگا ہو جائے گا۔"

شمشیر خاں۔ (کمر سے چھری نکال کر) جناب امیر علیہ السلام کی قسم ابھی اپنے کلیجہ میں مار لوں گا نہیں تو برائے خدا آپ چلے جا
سلطان صاحب اس دن سے کبھی خانم کے مکان پر نہیں آئے ہفتہ میں دو تین مرتبہ ضرور نواز گنج میں نوا

بیگ صاحب کے مکان پر بلوا بھیجتے تھے، عجب لطف کی صحبت ہوتی تھی، واقعی سلطان صاحب کو مجھ سے اور مجھے ان سے محبت تھی سلطان صاحب سے جیسا میرا دل ملا کسی سے نہ ملا۔ ایسے ہی جلسوں میں بیٹھ کر دنیا و مافیہا کا تو ذکر کیا انسان خدا کو بھی بھول جاتا ہے اور اسی کی سزا ہے کہ ایسے جلسے بہت ہی جلد برہم ہو جاتے ہیں اور ان کا افسوس مرتے دم تک رہتا ہے ۔۔۔۔!"

رسوا، نواب سلطان کو بڑے چاؤ اور محبت کے ساتھ پیش کرتے ہیں کبھی کبھی تو یہ خیال گزرتا ہے کہ رسوا نے غالباً نواب سلطان کے روپ میں اپنی شخصیت کو ظاہر کیا ہے مگر ایسا نہیں ہے نواب سلطان میں فطری سادگی ہے اور شرمیلا پن ہے جو مردانگی کے احترام سے پیدا ہوتا ہے ان میں جرأت بھی ہے مگر وہ صد درجہ محتاط ہیں انھیں فنون لطیفہ کا ستھرا مذاق ہے مگر جھوٹی تعریف پسند نہیں کرتے، وہ اپنی اندرونی قوت پر بھروسہ رکھتے ہیں اور انھیں کسی دوسرے سہارے کی ضرورت نہیں ان میں ظاہری حسن کے ساتھ ساتھ روحانی پاکیزگی بھی ہے اور وہ اُسے آلودہ ہوتے دیکھنا پسند نہیں کرتے وہ غیر معمولی نہیں مگر اپنے معاصرین سے بہت مختلف ہیں

وہ ناول میں اپنا پرتو ڈالتے اور کہیں دور چلے جاتے ہیں شاید وہ اپنے آپ کو سمجھنا اور اپنے تجربوں کو کوئی خاص رنگ دینا چاہتے ہوں بہرحال اتنا یقینی ہے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ مرنا نہیں چاہتے جن سے موت اور زندگی دونوں شرمندہ ہیں وہ اپنی دنیا بنانا چاہتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ ان کی دنیا مختصر پیمانے پر ہوگی کیونکہ وہ بہرو نہیں ہیں ان میں ایک بھرپور کائنات کو جگانے اور زندگی کا رس دینے کی صلاحیت نہیں، وہ عظیم نہیں ہیں ان سے ہمیں جو توقع ہے وہ صرف اس بنا پر کہ وہ گرا ہوئے نہیں ہیں ان کی شخصیت کا راز اس میں ہے کہ وہ عملی ہیں مانا کہ وہ بہت آگے نہیں دیکھ سکتے مگر ان میں ایک خوبی یہی ہے کہ وہ جیسا اور جہاں چلتے ہیں دیکھ بھال کر چلتے ہیں اور اسی لیے وہ آخر میں جیتتے اور زوال کے بھنور سے رہائی حاصل کر لیتے ہیں۔

عالم جو زوال کی آخری سانس تھیں ہیں مگر نہیں ہیں فیض علی جو زمین کے سینہ میں بپھرتے ہوئے لاوے کی طرح بدمست بلبلا رہے تھے زمین کے سینہ میں محفوظ ہیں، بوچیاں جو اس دور کی آخری سبیل تھیں کوئی ایسی بات ہیں جو یاد سے نکل گئی ہو، نواب جعفر علی جو امامت کا غمزۂ پیری تھے، چاند کے غار میں ہیں، نواب چھبن جو رقص کرنے کے لیے آمادہ ہوئے تھے بس دیوالیہ چلے گئے، کٹنیاں، پتر بنیاں، مولوی اور لونڈے کٹے ہوئے پتنگ ہیں اس طوفان سے کوئی ابھرا ہے تو وہ نواب سلطان ہیں کیونکہ وہ اپنا ہاتھ دلائی میں چھپائے رہتے ہیں نئے زمانہ کو سمجھتے ہیں اس سے مفاہمت کرتے ہیں آسودگی

اور عصمت کی زندگی بسر کرتے ہیں ان میں بہتری کی خواہش ہے پرانی اور نئی روش میں توازن پیدا کرتے مر
وار کرتے ہیں فرار نہیں کرتے وہ جنسی لذتوں میں بھی گرفتار رہیں ہیں ان میں اپنے آپ کو اور دوسروں کو سمجھنے کی

اب رسوا کا یہ بیان دیکھیے اور منظر کی جزئیات پر نگاہ رکھیے کیونکہ جیسا کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں ان کے یہا
ایک خاص اہمیت رکھتی ہے وہ کہانی کے حصوں کو آراستہ کرتے چہروں کو حقیقت کا رنگ دیتے ناظر کے دماغ کو
کسی فلسفے کی رہنمائی کرنے یا انسانوں پر کوئی خاص ٹھپہ لگانے کے لیے استعمال نہیں ہوتی اس کے برخلاف وہ عام طو
میں کسی خاص فضا کو جگانے کے لیے اور کہیں کہیں استعارے کے طور پر لائی جاتی ہے ان کا ن پور کے میلے اور اس کی فضا
"نہر کے کنارے ایک باغ تھا جس کے چاروں طرف مینڈھ سی بنی تھی اور دوسرے خاردار درخت اس طرح برا
گئے تھے جس سے دیوار سی بن گئی تھی باغ کی قطع بالکل انگریزی تھی تاڑ کھجور اور طرح طرح کے خوبصورت د
سے لگائے گئے تھے روستوں پر سرخی کٹی ہوئی تھی چاروں طرف سبزہ تھا جا بجا کنکروں کی پہاڑ ماں سی بنی ہوئی
انواع واقسام کے پہاڑی درخت پتھروں کے اندر سے اگے ہوئے معلوم ہوتے تھے پہاڑیوں کے گرداگرد دوب
باغ میں ہر چہار طرف پکی نہریں بنی ہوئی تھیں ان میں صاف ہولی سا پانی بہہ رہا تھا چمنوں سے پانی ٹپک
بکھر دھوپ کھائے ہوئے پھولوں میں جواب پانی پہنچا تھا کیسے ترو تازہ اور شاداب تھے تھوڑی
ہو گئی چاند نکل آیا چاندنی پھیل گئی تالاب کے پانی میں مہتاب کا عکس ... سے مل کر عجب کیفیت دکھا رہا تھ
کنارے پر بہت عالیشان کوٹھی تھی وسط باغ میں ایک پختہ تالاب سا ہوا تھا اس کے گرد ولایتی کیوڑے
خوبصورتی سے سجے ہوئے تھے اسی تالاب سے ملا ہوا - ایک اونچا چبوترہ تھا اس کے درمیان ایک مختصر سا
بنگلہ تھا اس کے ستونوں پر رنگ آمیزی کی ہوئی تھی اس تالاب میں نہر سے پانی گرتا تھا پانی کے گرنے کی
میں ٹھنڈک پہنچتی تھی واقعی عجیب عالم تھا شام کا سہانا وقت، سنہری ہوا، رنگ رنگ کے پھولوں میں
فضا میں نے کبھی نہ دیکھی تھی" اس میں کوئی شک بھی نہیں کیونکہ ناول میں اول سے آخر تک نہ جانے کتنے
دیتے ہیں وقت، موسم، فضا و ماحول تصویر کے پیکر میں ابھرتے اور دل و نگاہ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں مگر یہ
کہیں نہیں ملتی اور ہماری جمالیاتی حس جس طرح یہاں بیدار ہوتی ہے اور کہیں نہیں ہوتی جس وقت
گھر سے نکلتی ہے اور دلاور خاں اسے بہلی میں ڈال کر لکھنؤ کے لیے روانہ ہوتا ہے اس وقت کا منظر یہ ہے "چاروا

چھا گیا جاڑے کے دن تھے سناٹے کی ہوا چل رہی تھی سردی کے مارے میری بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی دم نکلا جاتا تھا"
اس کے بعد وہ منظر ہے جب امراؤ جان خانم کے یہاں لائی جاتی ہے اس وقت کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی ہے "دریا ٹھاٹھیں
مار رہا ہے" امراؤ جان کانپ رہی ہے پھر خانم کے دالان میں ایک جانب بوا حسینی کی کوٹھری دکھائی دیتی ہے تنگ اور تاریک
چراغ میں پتلی سوت سی بتی پڑی ہے ہوا اندھا اندھا جل رہا ہے لاکھ اکساؤ اونچی نہیں ہوتی" اس بیان کی روشنی میں
گرمیوں کے دن اور برسات کی راتوں کا تصور کیجئے اور پھر اس موقع کی فضا ملاحظہ کیجئے جب امراؤ جان وصال کے سانحہ کے
بعد آئینہ دیکھتی ہے "برسات کے دن ہیں آسمان پر گھٹا چھائی ہوئی ہے پانی تل دھار اوپر دھار برس رہا ہے بجلی چمک رہی ہے بادل
گرج رہے ہیں بوا حسینی کی کوٹھری میں اکیلی پڑی ہوں چراغ گل ہو گیا ہے اندھیری وہ کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا جب بجلی
چمکتی ہے مارے ڈر کے رلائی سے منہ ڈھانپ لیتی ہوں" اس کے بعد نوچیوں کے سجے ہوئے کمروں کی فضا کو دل و دماغ میں
جگائیے۔ "وہی نند نیں ہے گرم مرطوب سی فضا ہے صبح کا وقت کا سماں ہے دو کمرے روشن ہیں پھر مجروں کے ماحول
پر ایک چھپتی ہوئی نگاہ ڈالیے "وہی عطر اور پھولوں کی خوشبو سے بارہ دری بسی ہوئی" "دھواں دھار حقے، گلوریاں ان کی
بے پناہ مہک رات کا وقت تیگرہ سا ہوا سامنے زرق برق انسانوں کی ڈھیریاں یہی وہ مقام ہے جہاں سایہ شاخ گل افعی نظر
آتا ہے" اس کے بعد عیش باغ کے میلے کے اس منظر کو یاد کیجئے جس پر کافی بحث کی گئی ہے اس منظر میں آسودگی تو ہے مگر اس کا مجموعی
تاثر آسودگی میں خلل انداز ہوتا ہے پھر فیض علی کا معرکہ یاد کیجئے "جب بجا بھیٹر نے بڑے غار سامنے ندی کا کنارہ نظر آیا دور
تک دونوں طرف گنجان درختوں کی قطار تھی ... کوئی پہر دن چڑھا ہو گا چاروں طرف سناٹا ... دس بیس گنوار گاڑی
کی طرف دوڑے چلے آتے ہیں ... نواب سلطان بے بیٹھے" یہاں ویرانی اور وحشت کے علاوہ اور کیا ہے اس کے بعد فیض علی
امراؤ جان کو سرائے سے اڑا لے جاتے ہیں اور کانپور جا کر ایک مکان میں قیام کرتے ہیں مکان بھائیں بھائیں کر رہا ہے
دو پہر رات ہو گئی رات تک انگنائی اور دیواروں پر چاندنی تھی اب چاند بھی چھپ گیا بالکل اندھیرا گھپ ہو گیا" یہاں
بھی سوائے ہراس ہیبت اور ہیجان کے اور کچھ نہیں ہے ان مناظر کو دیکھنے کے بعد نواب سلطان کی ایک محفل کا سماں دیکھئے
جو ناول کے نصف دل میں سجائی گئی ہے "گرمیوں کے دن شب ماہتاب کا عالم صحن باغ میں تختوں کے چوکے پر سفید چاندنی
کا فرش ہے گاؤ تکئے لگے ہوئے ... باغ میں طرح طرح کے پھول کھلے ہوئے، بیلے اور چنبیلی کی مہک سے دماغ معطر" اس
فضا میں یقیناً روحانی اور جذباتی سکون ملتا ہے اور یہ بیان اس کا مزید ثبوت ہے کہ ناول میں اول سے آخر تک ہمیں صرف

وہی فضائیں اور مناظر لیکن پہنچاتے ہیں جو نواب سلطان کی شخصیت کے معنوی تاثر سے معمور ہیں ورنہ ہر کہیں تہ
بگولے ناچتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جہاں دیکھئے اندھیرا چھایا ہوا ہے ہر فضا میں دم گھٹے ہوئے ہیں ہر احول
ہے ہراس پیدا ہوتا ہے پیاس لگتی ہے گھٹن محسوس ہوتی ہے مگر ایک ساعت ایسی نہیں جس کے سایہ میں سکون اور ایک لمحہ
نہیں جس کے پردوں میں اس کے موتی نظر آئیں جب اور جہاں کہیں یہ سماں دکھائی دے وہیں ان کی سمت اور
روحانی مسافروں کی نجات ہے اور وہیں دل نگار کی بصیرت اور اچھی قدروں کی جیت ہے یہ فضا نواب سلطان کے ی
ہے اور کہیں نہیں اسی لیے امراؤ جان یہ کہنے پر مجبور ہوتی ہیں کہ "ایسی فضا میں نے کبھی نہ دیکھی تھی" ناول کے مناظ
کی فضاؤں پر جو تبصرہ کیا گیا ناول کے چہروں پر بھی صادق آتا ہے یہ چہرے اگرچہ مختلف مقامات پر نظر آتے
کے طبقے جنس اور حیثیتیں جدا گانہ ہیں اور اپنی اپنی کارکردگی کے اعتبار سے بعض اوقات ایک دوسرے کی ضد معلو
ہیں تاہم ان میں سے کسی ایک کے خط و خال میں بھی وہ حسن برنائی نہیں ہے جو نواب سلطان کے چھوٹے سے خانہ
نمایاں خوبی ہے دلاور بوڑھا ہو چکا ہے خانم اور بوا حسینی ادھیڑ ہیں مولوی صاحبان سوائے ایک کے سبھی آخری سحر
ہیں نوابین کی صورت بھی ردائے قنوط کی سی ہے گوہر مرزا بھی ادھیڑ ہوا جاتا ہے ریڈیاں بھی ڈھلی ہوئی دھو
غرض ان میں جو بھی ہے جوانی کی تازگی خون کے تموج اور پاکیزگی کے تاثر سے محروم ہے دو تین چہروں میں مردانگی
نسائیت کی کشش ہے اور ایک دو چہروں میں دل کی سادگی جھلکتی ہے مگر کسی ایک میں بھی بیک وقت توانائی
عصمت اور ترنم نہیں ہے۔

تیسری خاص اہم بات یہ ہے کہ ناول میں یوں تو نوابین بھی دکھائی دیتے ہیں اور مولوی بھی اس کے حصار
بھی ہیں اور وہ بھی ہیں جو گھر پھونک تماشہ دیکھتے ہیں ان اوراق میں رہزن بھی ہیں اور مختار بھی شعر و نغمہ کے
ہیں اور چاپلوسی کرنے والے مصاحبین بھی مگر کہیں بھی ہماری نگاہ باعصمت زندگی کے جاں بخش نظارے سے د
نہیں ہوتی ادھر دیکھتے ہیں جہاں جاتے ہیں ہر کہیں جسمانی لذتوں کے دام بچھے ہوئے ہیں ایک نواب سلطان ہیں ج
کو زندگی کی اعلیٰ قدر جانتے اور مانتے ہیں اس معاشرت میں صرف ایک خیابان ہے اور وہ نواب سلطان کا خا
ناول پڑھتے وقت اور پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں روح و بدن کی رسوائی انسان راہ ہے
ہے اور نکلو دھل کا آخری اندازہ ہے۔ طوائفوں سے راہ و رسم ڈومنیوں کے مجرے لونڈیوں سے چھیڑ چھاڑ پریوں

بیچنے والیوں کے سوانگ سے دامن بچا کر نکل جانا حیرت انگیز سلامت روی کا ثبوت ہے اور اس دور میں بدن کی عصمت کو برقرار رکھنا زوال کو شکست دینا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات جو بظاہر متصوفانہ معلوم ہوتی ہے مستقبل کی غیر ارادی طور پر ہوئی ہے مگر جس میں غضب کی اشاریت ہے ہماری توجہ کے لائق ہے۔ ہم نے اس معاشرت میں نہیں کوئی مستقبل کی علامت پائی ہے۔ اس دور کے خشت و سنگ ایک ایک کرکے ٹوٹ رہے ہیں بکھر رہے ہیں ان پر خستگی نے اپنی مہر لگا دی ہے ہمیں یقین ہے کہ ان میں کوئی ربط دینے والی چیز باقی نہیں مگر یہاں کس پیشانی میں وہ نور بھی ہے جو دوسری پیشانی میں منتقل ہو جائے کسی عورت کے بطن میں وہ رس پی پی کر جاگنے اور جگانے والی چیز ہے جو ہم سے پکار کر کہے کہ خدا ابھی اپنے بندوں سے مایوس نہیں ہوا ہے" اس لامتناہی سلسلۂ دشت میں کوئی بچہ ہے جسے ہم گود میں اٹھالیں، پیار کریں جو مسکرائے اور مستقبل کی بشارت دے اس کا جواب نفی میں ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسل ساری کی ساری بانجھ ہو گئی ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ لکھنؤ میں محمد علی اور واجد علی شاہ کے عہد میں کسی گھرانے میں چھٹی کی رسم ادا نہیں ہوئی نہیں اس سے کوئی بحث نہیں ہمیں تو ناول میں یہ دیکھنا ہے کہ کہاں اور کن لوگوں میں زندگی ہے کون تر و تازہ اور شاداب ہیں کون مردہ اور افسردہ اور بے ذوق ہو کر رہ گئے ہیں کن لوگوں کی شخصیت میں نشوونما ہو رہا ہے اور آئندہ بھی اس کا امکان ہے کون ایسے ہیں جو رات کو بھیانک خواب دیکھتے ہیں اور دل کی دھڑکن میں مبتلا ہیں کون ناکارہ ہیں اور جسمی بیماریوں کا نشانہ ہیں کون تندرست ہیں اور با عصمت زندگی گذارتے ہیں کون اپنے ارمانوں کی سچی تصویر اپنے سینہ سے لگائے ہوئے ہیں اور کس کی گود خالی ہے وہ کون سا ماحول ہے جس میں سیرابی ہے اور سبزی ہے اور وہ کونسی فضا ہے جہاں تشنگی ماتحیر کے سوا کچھ نہیں اس ناول میں اگر کہیں حسن و شادابی سکون بخش فضا، روح و بدن کی پاکیزگی اور مستقبل کی تازہ امید ہے تو وہ اسی بنگلہ میں ہے جس کی مصوری رسوا نے اپنا زورِ قلم صرف کر دیا ہے۔ رسوا نے اس سے پہلے بھی مکانات اور باغات کی مصوری کی ہے مگر اس میں جذبہ کی یہ فراوانی اور جزئیات کی یہ نزاکت نہیں۔ ناول میں اول سے آخر تک لفظوں نے کہیں بھی انگریزوں کے اثرات نہیں دکھائے ہیں اور یہ بات ہمارے مقصد کے لیے بہت اہم ہے کیونکہ ایک طور سے پلاسی کے محاذ کا آخری مورچہ تھا جس پر شاہ عالم ہار گئے نواب وزیر نے اس شکست کے بعد انگریزوں کے خلاف پھر کبھی تلوار نہ اٹھائی، ریاست کے مالیانہ کا ایک معتد بہ حصہ کمپنی بہادر کے نام پر لکھ دیا گیا کچھ عرصہ بعد نواب سعادت علی خاں نے بے خیالی میں ریاست کا آدھا علاقہ انگریزوں کے حوالے کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز

تاجر اودھ میں پھیل گئے اور ان کی عمارتیں اور ڈیرے تعمیر ہونے لگے رفتہ رفتہ ان کی سازشوں کا جال پھیلتا گیا یہاں تک کہ وزراء کے تقرر اور ہمسایہ ریاستوں سے تعلقات میں بھی ان کا مشورہ لیا جانے لگا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ شاہ دہلی سے نواب وزیر کا جو برائے نام علاقہ تھا وہ بھی جاتا رہا اور اودھ کی پیرانہ سال بیگمات کو انگریزوں کی سیاست اور ان کی طاقت کا ذائقہ چکھنا پڑا۔ ملک لٹ آصف الدولہ کے زمانہ میں تو عوام نے کوئی آنچ محسوس نہ کی لیکن جوں جوں موسم بدلتا گیا یہ تیز اور سبک ہوائیں لو کے جھونکوں میں تبدیل ہوتی گئیں مادی اقتدار کے بوتے چھکے جھکے مگر تیزی کے ساتھ مٹ جانے کا خواص کے مزاج اور عوام کے ماحول پر جو اثر ہوا وہ خوجی کے کردار، خانم کی دکان اور سوزخوانی کے کمال سے ظاہر ہے۔ مذہب کی ساری قوتیں رتجگی اور اس قسم کی دوسری رسموں میں، اعمال کی ساری نزاکتیں ماتم درباداری اور قحبہ خانوں میں، موسیقی کے روحانی کمالات بھیروں اور ہلکی پھلکی ٹھمریوں میں، سیاست کے بت نئے شگوفے حرم کی دیواروں میں اور آزاد زندگی کے بے شمار تقاضے بدھے ٹکے اور بے جان میلوں میں سمٹ کر رہ گئے غدر میں عوام کی دبی ہوئی نفرت ظاہر تو ہوئی مگر اس کی تہ میں کوئی عملی بصیرت اس کے سامنے کوئی روشن منزل اور اس کی حرارت اور قوت کا کوئی مرکز نہ تھا اس لیے جن طاقتوں نے اسے جنم دیا تھا وہی اس کی ہلاکت کا سبب بن گئیں۔ یہ زندگی کا ایک پہلو تھا اس میں وسعت بھی تھی اور قدامت بھی لیکن اس کی قسمت میں رسوائی تھی اس کے کے ساتھ ایک دوسرا پہلو تھا جس کی تہ میں چند زندہ عناصر تھے وہ مغرب کے فکر و عمل کی حولاہوں کے ترجمان تھے انھیں خود کو منوانا تھا اور وہ مان لیے گئے۔ یہ نئی بصیرت سیاست اور معاشرت کے نئے سانچے اور ان سے مفاہمت کا میلان ہمارے یہاں غدر کے ہنگامہ سے بہت پہلے پیدا ہو چکا تھا لیکن وہ فطری حالات کے زیر اثر ظاہر بعد میں ہوا یہی وہ شعور ہے جس کی ترجمانی ناول سے باہر کی دنیا میں حالی اور ناول کی دنیا میں نواب سلطان کرتے ہیں اور اسی لیے وہ ناول میں سمت کا حکم رکھتے ہیں

بہرحال زوال پذیر معاشرت کے ان مرقعوں میں ہمیں کہیں فطری خوشی نصیب نہیں ہوتی ہمیں ہر جگہ دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے کوئی مقام ایسا نہیں ہے جہاں ہمیں ذہنی، روحانی اور اخلاقی تسکین حاصل ہوتی ہو کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کا انجام، رس رس کے بہنا، گھل گھل کے مرجانا، لذتوں سے چور رہ کر زندگی کے دوسرے کنارے پر پہنچ جانا، خیال کی بے بسی، روح کی تہ مردگی اور دل و دماغ کی بے حسی نہ ہو۔ ان میں سے بعض کے متعلق ہمیں

یقین ہو جاتا ہے کہ وہ بے نتیجہ اور بے مراد مر جائیں گے اور ان میں سے بعض بے نتیجہ اور بے مراد مر چکے ہیں۔ صرف نواب سلطان ہمیں مژدہ سناتے ہیں وہ ہم سے مستقبل کا وعدہ کرتے ہیں ہمیں تازہ امید بخشتے اور نئے خواب دکھاتے ہیں ان کے یہاں کچھ کرنے کا عزم ہے ان کی زندگی میں سچی بھرپور اور جاندار خوشی ہے، ان کے لیے نہ زمین سخت ہے اور نہ آسمان دور ہے، ان کی نظر میں دونوں لامحدود ہیں، پراسرار ہیں اور نئے امکانات سے لبریز ہیں اور انھیں بصیرت، ہمت اور دلیری سے فتح کیا جا سکتا ہے۔ وہ ہیرو نہیں ہیں البتہ ان میں ہیرو بننے کی صلاحیت ہے یہی ناول کا انجام ہے اور یہی وہ نقطہ ہے جہاں قاری زوال کی شکست خوردگی اور بے کیفیوں سے نجات حاصل کر لیتا ہے اور جہاں پہنچ کر اسے محسوس ہوتا ہے کہ ایک نیا دور پردۂ افلاک سے طلوع ہو رہا ہے

کار ما از رخ ساقی و لب جام افتاد

تشویش

حسن نعیم

مجھ کو تشویش ہے کچھ روز سے میرے محبوب
میرے اندازِ تفکر کی یہ پُرخار روش
تیری حساس طبیعت کو نہ کر دے مجروح
اور تو سمجھے کہ نہیں تجھ میں وہ پہلی سی کشش
اب بھی جلووں میں ہے تخلیقِ محبت کی سکت
تیری باتوں میں ابھی تک ہے فسوں کا انداز
عارض و لب پہ تبسم کا خرامِ مدہوش
اب بھی دیتا ہے تخیل کو پیامِ پرواز
پھر بھی کیوں ہے کہ غمِ عشق کا احساس نہیں؟
جیسے سینہ میں امنگیں تو ہیں لیکن خاموش
جیسے لرزاں ہوں لبوں پر تو خوشی کی کرنیں
پھر بھی احساسِ مسرت کا نہ ہو ذہن کو ہوش
گن تو سکتا ہوں شبِ ہجر میں تاروں کو مگر
ذہن آوارہ خیالات سے بھر جاتا ہے
اشک مجبور رہا ہوں غمِ جاناں میں مگر
سلسلہ میرے ان اشکوں کا بکھر جاتا ہے!
مجھ کو تشویش ہے کچھ روز سے میرے محبوب
میرے اندازِ تکلم کی یہ بیگانہ روی
تیری حساس طبیعت کو نہ کر دے محزوں
اور تسکیں نہ ہو، پھر حسنِ خود آرا کو کبھی

مسعود حسین خاں

ہندی پنگل (عروض) کی مبادیات

تاریخ جس طرح زبان پہلے بنتی ہی اور اس کے اصول بعد کو مرتب کیے جاتے ہیں۔ شعر بھی علم عروض سے پہلے وجود میں آتا ہی۔ قدیم ہندوستان میں ویدوں کے الہامی نغموں کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے پہلی بار علم عروض کے اصول مدون کیے گئے۔ ویدوں کے مطالعہ کے لیے جن چھ شاستروں کا مطالعہ ضروری ہی ان میں چھند شاستر (کتاب العروض) بھی شامل ہی لیکن ویدوں میں بحروں کی تعداد بہت کم تھی اس لیے ان کے عروضی قاعدے بھی سیدھے سادے اور مختصر تھے تمام کلاسیکی زبانوں (مثلاً یونانی، لاطینی) کی طرح ان میں بھی صرف حروف کی تعداد گن لی جاتی تھی

لیکن ۶۰۰ ق م میں ادبی سنسکرت کی تشکیل کے ساتھ ساتھ فنون میں رنگینیاں اور علوم میں گہرائیاں بڑھنے لگیں۔ شعر عام مقبول ہو گیا اور اس میں وسعت آ گئی تو اس کے اصول بھی زیادہ چابکدستی سے تیار کیے گئے۔ یہ زبان و ادب دونوں کے ارتقا کا زمانہ تھا پانینی نے ۳۰۰ ق م میں سنسکرت کی قواعد لکھ ایک طرح سے اس کی شکل ہمیشہ کے لیے متعین کر دی۔ پنگل رشی نے اسی زمانہ میں اپنی "چھند شاستر" (کتاب العروض) تصنیف کر کے وہ مقبولیت حاصل کی کہ ہندوستان میں علم عروض کو پہلے "پنگل شاستر" اور بعد کو صرف "پنگل" کہنے لگے۔ آج بھی پنگل سے ہندی کا علم عروض ہی مراد ہوتا ہی۔

سیاسی انقلابات کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی زبانوں میں الٹ پھیر ہوتا رہا شعر و ادب کے سانچے بھی بدلتے رہے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ علم عروض جامد رہتا اس میں بھی ترمیم ہوتی رہی پرانے اوزان متروک ہوتے رہے اور نئی بحریں بنتی رہیں۔ ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں میں سنسکرت کے بیشتر اوزان ترک کر دیے گئے۔ پھر بھی اس علم کی تمام اصطلاحات اور بعض بحریں بھی سنسکرت ہی کی رکھی گئیں قدیم ہندی شاعر (جائسی، تلسی، سور، کبیر وغیرہ) نے زیادہ تر دوہا، چوپائی اور سویا

ان گنوں کے نام یاد رکھنے کے لئے ان کا یہ مجموعی نام یاد رکھئے۔

"من بھئے جرست" (م + ن + بھ + ی + ج + ر + س + ت)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بحر بنانے کے لئے ان گنوں کی ترتیب کس طرح ہو۔ یہاں پھر سنسکرت زباں کے عروضیوں نے بعض سائنٹفک حقیقتوں کو اپنے توہمات کے پردوں میں چھپانا چاہا ہے۔ ان کے خیال میں ہر گن کا ایک دیوتا ہے۔ اوپر دئے ہوئے آٹھ گنوں میں سے چار کو انھوں نے شبھ (مبارک) مانا ہے اور چار اشبھ (نامبارک)۔ م گن۔ ن گن۔ بھ گن اور ی گن مبارک خیال کئے جاتے ہیں۔ اور ج گن۔ ر گن۔ س گن اور ت گن نامبارک۔ بس تو مصرع نامبارک گنوں سے نہیں شروع کرنا چاہیئے۔ یہ شعر میں شتم ہوتا۔ اس مبارک اور نامبارک کے پردہ میں سائنٹفک حقیقت کو دیکھیں تو بس اتنی ہے کہ بعض "گن" میں حروف اس طرح مرکب ہوتے ہیں کہ وہ مصرع کے شروع میں لائے جائیں تو اس کی موزونیت میں فرق پڑتا ہے۔ اور اسی لئے اکثر اوقات شاعران پابندیوں کی پرواہ بھی نہیں کرتے۔

گنوں کی طرح بعض حروف کو بھی ہندی عروضیوں نے نامبارک کہہ کر شروع میں لانا روا نہیں رکھا ہے۔ حروف علت سب کے سب نامبارک خیال کئے جاتے ہیں۔ حروف صحیح میں ک۔ کھ۔ گ۔ گھ۔ چ۔ چھ۔ ج۔ ت۔ د۔ دھ۔ ن۔ ی۔ ش۔ س۔ اچھے مانے گئے ہیں اور باقی برے ان میں خاص طور سے جھ۔ ر۔ بھ تو بالکل گئے گزرے مانے جاتے ہیں اور اس لئے ان سے کوئی ورنک چھند شروع نہیں ہونا چاہیئے۔

تک (قافیہ) ہندی پنگل میں قافیہ کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ جب مصرعوں کے آخر میں ایک ہی حرف علت یا حرف صحیح آئے تو اسے "تک (قافیہ) کہتے ہیں۔ اچھا تک وہ ہوگا جس کے آخری حرف صحیح سے پہلے کا حرف علت بھی یکساں ہو۔ ہندی میں شروع سے "تک والی شاعری" ہوتی آئی ہے۔ "بے تک بات" اسی لئے محاورہ بن گئی ہے۔ "تک کی چاشنی ہندی شاعری کے منہ کو ایسی لگ گئی ہے کہ بعض عروضیوں نے تو اسے اس کا ضروری جزو سمجھا ہے لیکن سنسکرت میں کچھ

بے تک کی شاعری بھی ملتی ہے۔ اور ہندی میں بھی برج لال اور ہری اودھ وغیرہ نے جائز قرار دیا ہے۔

تک کی تین قسمیں مانی گئی ہیں۔

(۱) اُتم (سب سے اعلیٰ) (۲) مدھم (درمیانی درجے کا) اور (۳) ادھم (نچلے درجے کا)

(ا) اگر مصرع کے آخر میں دگرو (SS) آئیں تو وہاں پانچ ماترائیں ایک سی آواز کی ہونے پر اُتم ہوگا۔

(۲) اسی طرح چار ماترائیں یکساں طور پر آئیں تو مدھم ہوگا۔

(۳) اگر اس سے کم ہوں تو ادھم

(ب) اسی طرح مصرع کے آخر میں گرو (IS) یا لگھو گرو (SI) کی ترتیب ہو اور پانچ ماترا ہو جائیں تو تک اُتم ہوگا۔ چار ہوں گی تو مدھیم) اور تین کا ادھم۔

(ج) اگر مصرع کے آخر میں دو لگھو (II) آئیں تو چار ماتراؤں کی تکرار ہونے پر تک اتم، تین پر مدھیم اور ایک پر ادھم[1]

(۳) چھندوں کی تیسری قسم

چھندوں کی تیسری قسم یہ ہے کہ اگر کسی طرح کے چاروں مصرعوں میں ماترائیں اور حروف برابر ہوں تو اسے سم کہتے ہیں۔

جس بحر میں پہلے اور تیسرے اور دوسرے اور چوتھے چرنوں (مصرعوں) میں ماترائیں اور حروف یکساں طور پر آجائیں تو انھیں اردھ سم (اردھ = آدھا) کہتے ہیں۔ اور اگر چاروں چرنوں کی ماترائیں اور حروف کی تعداد مختلف ہو تو اسے "وشم" کہتے ہیں۔

---

[1] دیکھئے اُردو عروض میں قافیہ کا بیان۔ جو کام وہاں حروف کی تکرار اور حرکات وغیرہ سے لیا گیا ہے لگھو اور ماتراؤں کی یکسانیت سے لیا گیا ہے۔

ان کے علاوہ ماتراؤں اور حروف کی تعداد کے لحاظ سے بھی چھندوں کو تقسیم کیا جاتا ہے۔
ے چھندوں میں ۳۲ ماتراؤں تک والی بحر کو سادھارن (معمولی) چھند کہا جاتا ہے۔ اسی طرح
حروف والی ورنک چھندوں کو بھی سادھارن کہا جاتا ہے۔ ۳۲ ماتراؤں سے اوپر کی ماترک بحریں
۲۸ حروف سے اوپر کی ورنک بحریں ونڈک کہلاتی ہیں۔
چھندوں کی قسموں کے لئے ذیل کا نقشہ دیکھئے۔

چھند

- ماترک (لگھو گرو ماتراؤں کی گنتی)
  - وشم
  - اردھ سم
  - سم
    - ونڈک (۳۲ ماتراؤں سے اوپر کے)
    - سادھارن (۳۲ ماتراؤں تک)
- ورنک (ماتراؤں کی ترتیب گنوں میں اور حروف کی گنتی)
  - وشم
  - اردھ سم
  - سم
    - ونڈک (۲۶ حروف سے اوپر کے)
    - سادھارن (۲۶ حروف تک)

(۲۵ جنوری ۱۹۳۹ء)

شجاع احمد زیبا

غزل

طوفاں میں سب رہے ہیں یہ سچ ہے تو کیا ہوا
خود کشتیٔ حباب سلامت نہیں رہی

اشکِ غمِ فراق بدستور ہے مگر
اب آنسوؤں سے رونے کی عادت نہیں رہی

شاخیں بھی آشیاں کو سہارا نہ دے سکیں
اب جورِ آسماں کی شکایت نہیں رہی

دیر و حرم کو خونِ بشر اب بھی چاہیئے
گو شیخ و برہمن کی سیادت نہیں رہی

خاک کی ٹوکری راہ میں ڈال دی تھی، میں سنبھلا آگے موڑ پر کارپوریشن کا گیس نہایت مری سی روشنی سے گویاں کو موڑ کا اشارہ کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا رات کے گذرنے کے ساتھ ساتھ اسے بھی جھپکی آ رہی تھی اور یہ بھی سوجانا چاہتا تھا لیکن میں گذر کر آگے جا رہا تھا میرا سایہ مجھ سے آگے بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے سوچا۔ جس طرح روشن زمانہ میں سایہ ساتھ نہیں چھوڑتا یہ عورت ذات بھی اسی طرح مرد کے پیچھے لگی ہوتی ہے تاریکی کے عہد میں یہ بھی ساتھ نہیں دیتی۔ مرد بیچارہ مرد اس کی زندگی کی ذمہ داری لیتا ہے اس کے لیے مرتا ہے اور اسی کے لیے جیتا ہے۔ خون پسینہ ایک کرتا ہے صبح سے شام تک کارخانوں میں دفتروں میں گاڑیوں میں وطن سے دور عزیزوں کی نظر سے پرے زمین پر زمین کے نیچے پانی میں، ہوا میں نہ معلوم کہاں کہاں جھک مارتا ہے کس لیے؛ صرف عورت ذات کے لیے اس کو خوش کرنے کے لیے، اس کو آرام پہنچانے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیتا ہے لیکن اس کی محنتوں کا جواب کیا ملتا ہے؛ مرد ظالم ہے۔ عورتوں کی حق تلفی کرتا ہے۔ اسے قید میں رکھتا ہے اس کی آزادی کا دشمن ہے، غاصب ہے، ظالم ہے، درندہ ہے، بے انصاف ہے اور نہ معلوم کیا کیا؟ میں چھوٹی چھوٹی گلیوں کے موڑ سے خود بخود گذرتا جا رہا تھا دماغ کہیں اور تھا لیکن نگاہیں قدم کی رہبری کر رہی تھیں۔ "دیکھو، انسانی تہذیب کا خون کس قدر گندہ ہو رہا ہے؟ یہ میرا اپنا رنگ نہیں ہے یہ وہ رنگ ہے جو ایک دو رات نہیں بلکہ زندگی کی ساری راتوں کو انہی گندگیوں کی سڑاند پیدا کرنے والے شاہراہوں میں گذارنے سے میری روح میں جذب ہو گیا ہے کوٹھریوں کے سامنے سیڑھیوں پر ان کے مکینوں کی زندہ لاشیں پڑی ہوئی ہیں جسم زندہ ہے مگر روح رخصت ہو چکی ہے، احساس مر چکا ہے۔ آگے بائیں جانب کچھ کھڑی بھی ہیں ایک طرف ایک کو حرکت ہوئی ایک مرد کے گذرنے کی آہٹ محسوس ہوئی اور الاپ اٹھی: "انکھیاں ملا کے جیا بھرما کے چلے نہیں جانا" میں تیزی سے جسم کو سمیٹتا ہوا آگے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسری نے راگ ملایا۔ "رم جھم برسے بادروا، پیا گھر آجا" میرا خون غصہ سے کھول رہا تھا۔ یہ آزادی چاہتی ہیں حق طلب کرتی ہیں، ذلیل کہیں کی، بے حیا اور دوسری نیک بخت کو دیکھئے ان کے لیے وقت بے وقت ہر وقت بادل بھی رم جھم برسنے لگتا ہے اور ساجن کی یاد بھی ان کو کسی بھٹکے ہوئے مسافر ہی کو دیکھ کر آتی ہے۔ کمینی ڈائن کہیں کی نہ معلوم کتنے معصوم اور شریف مردوں کی زندگی کو دق کے جراثیم کی طرح

تباہ کیا ہوگا اور ابھی تک ارادوں میں کوئی کمی نہیں محسوس کرتیں۔ کون کہتا ہے کہ یہ صرف کمزور طبع ضعف دماغ اور ناقص العقل ہیں؟ یہ وہ عذاب ہے جو نہ معلوم حضرت آدم کو کس گناہ کی پاداش میں ملا تھا" میں گلی سے مڑا لیکن کسی چیز سے ٹکرا گیا "معاف کیجئے گا" میری زبان سے بے ساختہ نکلا اور سمٹتا گیا لیکن اس کے جواب میں کئی قہقہے بلند ہوئے اور میرے جی میں آیا کہ یا تو ٹکرانے والی کا گلا دبا دوں یا بے تحاشا وہاں سے بھاگ جاؤں۔ قہقہے مسلسل بلند ہو رہے تھے اور میں تیز تر بھاگا جا رہا تھا۔ سلسلۂ خیال ٹوٹ چکا تھا۔ پان والے کی دکان کے پاس سے مڑا آگے بھٹیار خانے کی گلی کو پار کیا اب جینا پاڑہ میں داخل ہو چکا تھا ذرا جان میں جان آرہی تھی اگرچہ دماغ ابھی تک پریشان تھا۔ گلی کچھ کشادہ ہونی شروع ہو چکی تھی مگر یہاں سکوت تھا۔ میں بڑھا جا رہا تھا سامنے جیبوں کے ہوٹل میں لوگ تیلیوں سے چاول کھا رہے تھے ہوٹل والا بیٹھا اونگھ رہا تھا گلی داہنی طرف گھوم کر بائیں جانب مڑی۔ اس جگہ گیس کی روشنی ذرا تیز تھی۔ ایک میلی نصف پتلون اور گنجی پہنے دیوار کے سہارے بیٹھا تھا مجھے دیکھتے ہی اس نے سیٹی بجانی شروع کی میں نے مڑ کر دیکھا۔ اٹھتے ہوئے میری طرف بڑھا میں رک گیا۔ قریب آکر بولا "صاحب کچھ چاہیئے" میں کچھ نہ سمجھ سکا "کیا؟" میں نے پوچھا۔ بولا "کچھ چیز دکھائیں صاحب" مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں اب پاگل ہو جاؤں گا "نہیں نہیں بخشو بابا مجھے کچھ نہیں چاہیئے، کچھ نہیں چاہیئے" بڑبڑاتا ہوا میں تیز تیز بھاگنے لگا۔ لاحول ولا قوۃ۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں اس راہ سے آیا ہی کیوں؟ بزرگوں نے صحیح کہا تھا کہ سال بھر کی محفوظ راہ چھوڑ کر اس راہ سے بہتر ہے جو خطرناک ہو۔ اب تو جانا ہی تھا واپس ہونے کی بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ چنانچہ جس قدر تیز چل سکتا تھا بھاگا جا رہا تھا۔ بچوں کے کھیل کا میدان گزار کر داہنی جانب مڑ چکا تھا یہاں یہودیوں کا عبادت خانہ اور مسلمانوں کی مسجد دونوں ساتھ ہی ساتھ ہیں آگے چوراہے پر سگریٹ کی دکان کھلی تھی اس کے پاس والی میوہ کی دکان بند ہو رہی تھی سگریٹ والے کی دکان میں روشنی کے سامنے کلنڈر میں نرگس کی نہایت حسین تصویر لٹکی ہوئی تھی۔ ٹیڑھی مانگ نکالے سر جھکائے لیکن نگاہیں حشر کا ساماں بنی ہوئی۔ اس تصویر کو میں نے آج سے پہلے بھی کئی دفعہ دیکھا تھا اور واقعی بڑی بھلی معلوم ہوئی تھی لیکن ابھی اسے دیکھ کر

سخت نفرت کا جذبہ پیدا ہو رہا تھا۔ ان کمبختوں نے آزادی اور حقوق کے نام پر کیا کیا ظلم نہیں کئے ہیں ان کی تو ان کی ان کی تصویروں کی بھی پرستش کی جائے یہی ان کی عصمت یہی حیا اور یہی احساس آبرو ہے اور ان بھولے بھالے مردوں کو آخر کیا ہو گیا ہے کہ ان پر مرے چلے جاتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں اگر یہ آزادی چاہتی ہیں راستہ دے دو حقوق طلب کرتی ہیں پیش کر دو برابری کا دعویٰ کرتی ہیں کرنے دو مرنے دو، جہنم میں جانے دو، تم ان کے لیے کیوں جان دیتے ہو؟ نہیں، مرد انصاف پسند ہے، سمجھدار ہے لیکن رحم دل ہے اور محبت والا دل بھی رکھتا ہے، وفا بھی جانتا ہے وہ اپنے اخلاق سے کیسے بے پروائی برت سکتا ہے؛ لیکن ایسا بھی کیا اخلاق جو تمہیں ان کا غلام بنا دے، ان کا محتاج کر دے ان کے رحم و کرم پر تم کو چھوڑ دے۔ نہیں! تم کو ان کے ماتحت نہیں ہونا چاہئیے۔ یہ ذلیل ہیں　　اور ناقص العقل ہیں۔ نہیں سمجھیں تو ڈالو ان کو جہنم میں۔ میں بھو بازار کی سڑک پار کر رہا تھا۔ آج میرا جذبہ ان کے خلاف زبردست طور پر بھڑکا ہوا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ مجھے ایک گھنٹے کی بھی خدائی مل جائے تو میں اس صنف کو ہی ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کر دوں انسان کو انسان بن کر دنیا میں رہنا سکھا دوں، عورت کے نام کا وجود ہی ابد کے لیے ختم کر دوں، اس جڑ کو ہمیشہ ہی کے لیے اکھیڑ پھینکوں جو ہماری زندگی کو ساس بہو، دیور بھاوج اور میاں بیوی کے آئے دن کے جھگڑے سے پاک کر دے۔

بھو اسٹریٹ کی تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں صرف ایک دکان کرسیوں کا بید بننے والے کی کھلی تھی دوکان کے باہر سڑک کے کنارے ایک نوجوان مزدور بیدوں کو آگ کا تاؤ دکھا کر سیدھا کرنے کی کوشش میں منہمک تھا۔ اس کے دوسرے ساتھی یا تو سو چکے تھے یا اس کی کوشش کر رہے تھے لیکن یہ نوجوان دھیمے سروں میں کچھ گنگناتا ہوا بیدوں کو سیدھا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی صورت کہہ رہی تھی کہ اس نے زندگی کی بہاریں ابھی زیادہ نہیں دیکھی ہیں مگر اسی امید میں کسی امید موہوم کا فریب خوردہ ہے۔ انتھک محنت اسی امید کے سہارے قائم رکھے ہے شاید اس کے لیے رات بھی دن ہے یا رات آرام کے لیے نہیں بنی پتہ نہیں کون سی امید اسے کشاں کشاں اس طرف لیے جا رہی تھی۔ یعنی یہ بھی مظلوم ہوگا۔ اس پر بھی اختیارات کسی بنت حوا کے ہوں گے اس عمر میں اور یہ حالت؟

اسے خبر نہیں کہ دنیا کہاں سے کہاں جا رہی ہے؟ انسانی زندگی میں کیسے کیسے انقلاب آ رہے ہیں مگر یہ تو اسی محور کے گرد ناچتا رہے گا۔ یہ تیلی کا بیل ہے ایک کھونٹے سے لگا دیا گیا ہے اور یہ ساری عمر اسی کے گرد گھوم کر گزار دے گا۔ اس کے لیے انقلاب نام کی کوئی چیز دنیا میں نہیں۔ یہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ دنیا انقلاب سے زندہ ہے۔ انقلاب، تو زوالِ سرمایہ پرستی کے خلاف، سوشلزم کی آوازیں، اور پتہ نہیں دنیا میں کیسے کیسے انقلاب آ رہے ہیں لیکن نہیں آتا ہے انقلاب تو اس ظالم صنف کی حکومت میں کیوں نہیں ایک لینن، ایک ابراہم لنکن، ایک گاندھی یا ایک جناح ایسا بھی پیدا ہوتا ہے جو اس جبر و ستم کے خلاف آواز اٹھائے، نعرے لگائے اور چیخ چیخ کر کہے "جنس حوا کی حکومت مردہ باد" "آزاد مرد، زندہ باد" اور کیوں نہیں یہ کمبخت ان بیدوں کو آگ دکھانے کی بجائے اپنی آتش طبع کو ذرا آنچ دے کر اس ظالم جنس کو سیدھا کرنے کی کوشش کرتا؟ بید آگ کی گرمی سے سیدھے ہو سکتے ہیں تو مرد کی طبیعت میں اتنا جوش اتنی تپش نہیں ہے کہ وہ اپنے غیظ کی بھڑکتی ہوئی چنگاری پر ان کو سیدھا کر لے" مسز رواکشٹو کی چوڑی سڑک میری راہ کو کاٹ رہی تھی بائیں جانب دو فرلانگ پر برڈ ووڈ سے ایک [illegible] والے کا نکل کر سامنے والی کار میں گھسا "پھر وہی غلامی وہی عورت کی حکومت [illegible] صاحب پہلے کار میں داخل ہوں پھر خود گھسنے کی ہمت کریں گے واہ رے مطیع مرد! اور واہ رے خدا! اطاعت کے لیے ان مخلوق میں [illegible]ی کو اس قابل نہیں سمجھا تھا مرد نے کیا جرم کیا تھا؟ کس گناہ کی پاداش میں یہ سزا اسے عطا کی۔

سڑل اوینو گذر چکا تھا اور پرنسپ سٹریٹ سے چاندنی میں مڑ رہا تھا۔ سامنے اجڈ یہ ہوٹل کا تختہ الٹ چکا تھا۔ میزوں پر کرسیاں اوندھا دی گئی تھیں

گم گھر لین بھی گم سم تھی۔ مجھے یاد آیا آج صبح وہ سامنے والا عیسائی اپنی میم سے غصے میں سرِ راہ اسی جگہ تو کہہ رہا تھا "سچ کہا ہے کہ وہی عورت جو کبھی اپنے قدموں کے نیچے جنت رکھتی ہے کبھی چڑیل بن کر جہنم کے انگارے بھی انڈیل سکتی ہے" اس نے صحیح کہا تھا کیونکہ قدموں کے نیچے جنت بسانے والی ہی نے تو جنت سے آدم کو نکلوایا تھا اور اب مرد کو اپنے قدموں کے نیچے

بنت تلاش کرنے کو کہتی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اس گلی کی ہر ہر شے لیمپ پوسٹ، کوڑے
اٹھی، ہاتھ کا ٹھیلا، اونچی دیواریں، بند دروازے اور کھلے دریچے سب ہی چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں مرد
غلام ہے، بے حد بزدل ہے، احمق ہے، [illegible] ہے۔ مجھے غصہ آ گیا۔ طبیعت چاہی کہ آج ایک ایک عورت کی بوٹیاں نوچ لوں
ان کے پرخچے اڑا دوں۔ دنیا میں ہمیشہ کے لیے اس کا نام حرفِ غلط کر دوں۔ مرد کی زندگی کے اس
بدنما داغ کو برابر کے لیے صاف کر دوں، اس کی تاریخ کے اس آبلہ کو ابد کے لیے توڑ دوں۔ ساری
دنیا کے مرد کو بغاوت سکھا دوں۔ انقلاب پیدا کر دوں اور اس انقلاب کے سیلاب میں مرد کی زندگی کی
اس سڑاند کو بہا دوں" آ۔ آ۔ ہ" ایک دبی سی چیخ سنائی دی اور میں چونک کر ایک قدم پیچھے
ہٹا۔ "دور ہو میری نظروں سے۔ نکل جا میرے گھر سے" میں نے اپنے مکان کے صدر دروازے
کے اندر پاؤں رکھا تھا کہ عادل [illegible] اپنی بیوی صابرہ کو دھکا دیتے ہوئے گرجا۔ صابرہ
منہ کے بل گری۔ صرف ایک دبی سی چیخ اس کے حلق سے نکلی تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ ٹوٹی ہوئی
چارپائی کا سہارا لے کر اٹھی۔ عادل کے قدم پکڑے "میرے سرتاج! پھر آپ ہی بتائیے میرا کیا جرم ہے؟
میں آپ کی چوکھٹ چھوڑ کر کہاں جاؤں۔ اب میرا کون سہارا ہے؟" پاس ہی اس کا بڈھا سسر
بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ "کمبخت تیری کوکھ [illegible] ہمارے لیے کیا میری نسل ختم ہو جائے گی؟"
صابرہ سسکتی ہوئی بولی۔ "آپ شوق سے [illegible] میں منع تو نہیں کرتی میں ایک دایہ ہی
بن کر رہوں گی۔ مگر مجھے اپنے پاؤں سے تو نہ روندیے۔"
اب میرا سر بڑی تیزی سے چکر کھا رہا تھا۔

(۱۵ر دسمبر ۶۴ء)

کر رہی تھیں میرا غصے سے بُرا حال تھا۔ یوں میری انسلٹ کرنے کا انھیں کونسا حق ہے۔ کچھ زیادہ بڑی تو نہیں صرف
چھ مہینے ہی بڑی ہیں۔ پھر بھی بزرگی کی شان جھاڑتی ہیں۔ چچا جان کی اکلوتی صاحبزادی ہیں اس کا مطلب یہ تو
نہیں کہ سب ہی ان سے لاڈ کریں اور انکو نخرے اٹھائیں۔ میرا دل باغیانہ خیالات سے بھر گیا۔ اور یہ شاید شگفتہ
صاحبہ میرا حسن تصور ہیں کہ ... سی ہوئی ہیں اور آپا سماں ان کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر دیتی ہیں"
واقعی تھیں تو حسین۔ شاید وہ بھی اپنی ممی کی طرح شریر تھیں سمجھ میں نہیں آتا کہ لڑکیاں اتنی شریر اور بے باک
کیوں ہوتی ہیں "طرفہ!" میں نے اپنی چھوٹی بہن کو پکارا "پاگل کی پکار بھی سُن لو۔ شگفتہ! آپا بے طرح
پکار رہی تھیں ... بھائی جان" دراصل میں نے اپنا غصہ ... کو دکھایا تھا۔ جب وہ تنہا ہوتی
ہے تو میں ... آپا سماں کو دیکھ کر انھیں کی سی بھی بن جاتی ہے۔ آواز "شگفتہ باجی! جیتی رہو
آؤ بھئی ... تمہاری ... جانے کب تک آئے گی۔ طرفہ کالج جانے کو دیر ہو رہی ہے۔" شاید آج
اپنے خیالی کالج جائیں گے؟ نواب صاحب نے ابھی تک چائے بھی نہیں پی" آپا نے پھر منہ مارا لاحول ولا
بے وقوف ... آپا کے سامنے ہی ہوتی ہیں۔ اور آپا بھی اتنی تیز ہیں چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی بھانپ لیتی ہیں
مجھے اپنے پر غصہ آنے لگا "درست ہے میاں! بچے غلطی کرتے ہی ہیں۔ شگفتہ لو آج چھٹی ہے" چھوڑو
بھئی آپا سماں! تم تو ... پریشان کر دیتی ہو۔ آپ ان کی کم گوئی اور معصومیت پر نہ جائیے ــــ اچھا
نواں کی اتنی دیر کی ... کی یہی سزا ہے کہ ہمیں بھی ناشتہ میں شرکت کرنے کو کہیں اور چائے بنا کر ہمیں
پیش بھی کریں" آپا نے میری طرف ... سرکائی ... سے چائے بنانے لگا میں نے شکر ڈال کر آپا کی
پیالی میں چائے ڈالنا چاہی تو انھوں نے پھر میرا مذاق اڑایا۔ ماشاء اللہ خوب۔ اجی حضرت پہلے مہمان کو پیش
کیجئے" یہ تو بڑی مصیبت آئی۔ خدا جانے یہ کتنی میٹھی چائے پسند کرتی ہیں۔ خیر میں نے تین چار چمچے شکر ڈالی۔
جب پیالی بڑھانا چاہی تو آپا نے زور سے "اوں ـــ کہا میرا ہاتھ کانپا اور پیالی شگفتہ کی گود میں جا پڑی۔
وہ گھبرا گئی۔ "یا خدا رحم کر کیا سب حماقتیں آج ہی ختم ہوں گی" میں کھسیانہ ہو گیا۔ سفید سلک ساری پر چائے
کے داغ پڑ گئے۔ جب ایک کام آتا نہیں تو کرتے کیوں ہو؟" صبح کی ہلکی سردی میں بھی میں پسینے سے بھیگ گیا۔ چائے
دوبارہ بنا کر دی۔ ایک گھونٹ لے کر شگفتہ نے پیالی میز پر رکھ دی۔ "کیا بات ہے" آپا نے جواب سنے بغیر

ایسی بیوقوفیوں سے الٹی سیدھی گیندیں پھینکی ہیں کہ ہنسی کے مارے برا حال ہوگیا۔ وہ تو انھیں ہٹا دیا گیا ورنہ
خدا جانے کیا ہوتا۔ اور اس دن ڈرامہ [illegible] میں گئی جیسے ہی صدر نے ان کا نام لیا حضرت زرد پڑ گئے
اب جو اسٹیج پر آئے تو لب نہ ہلا سکے۔ بولنا تو کیا۔ بس کھڑے کانپ رہے تھے۔" آپا سماں صریحاً جھوٹ بول رہی
تھیں۔ سماں اس قدر جھوٹ سے کام نہ لو۔ اس دن تم یہاں تھی ہی کب؟ اب اٹھو آپا" میں سیر ہوگیا کسی دوسرے
کو دیکھا ہوگا تم نے۔" اتنے میں کھیل شروع ہوگیا اور کچھ دیر اور میری [illegible] میں محو ہو گئی
کھیل دیکھتے دیکھتے آپ ہی آپ میری نظریں تماشائیوں کے بجائے پردہ پر جاتی تھیں جو [illegible] ادھر سے میں جھک رہی تھی۔
کئی دفعہ میں نے یہ محسوس کیا وہ بھی دیکھ رہی ہے۔ مگر نگاہ ملتے ہی آنکھیں پردہ کی طرف پھیر لیتی تھی۔
انٹرول میں شگفتہ نے چاکلیٹ اور ٹافی سرو کی۔ مجھے [illegible] آپا کی ہلکی سی ڈانٹ
کھائی۔ میں نے ٹافی [illegible] رکھنا چاہی تو خواہ مخواہ ہی [illegible] میں نے گھبرا کر
کاغذ منہ میں رکھ لیا۔ آپا نے پھر ہنسنا شروع کیا۔ بھلا شگفتہ نے کس [illegible] کہ وہ دیکھیں بھی۔ اب تو
کھیل شروع ہوا تو ایک منظر نظر آیا۔ اس کا پلاٹ تھا "[illegible]" میرا دل آ گیا تھا۔ ایک لڑکی جو پہلے
سے اس کی محبت میں گرفتار تھی مگر اظہار کا موقع نہیں ملتا تھا۔ اس کی محبت کے بہانے ایک خوبصورت پھولوں
کا ہار لے کر گئی اور اس کے گلے میں ڈال کر نیچی نگاہ کر کے کہا۔ "یہ محبت کا حقیر تحفہ ہے" حضرت نے جو محبت
کا نام سنا تو گھبرا کر بھاگے [illegible] تمام ہال قہقہوں سے گونج گیا۔ آپا سماں اور شگفتہ موقع سے فائدہ نہ
اٹھاتیں ناممکن تھا۔ "بالکل [illegible] شکل بھی اور فطرت بھی کوئی بات نہیں چھوڑی [illegible] کہاں "دسماں
حد کر دی تم نے تو صرف ناک ہی تو ملتی ہے۔ صورت تو بالکل مختلف ہے" ہم جانتے کیوں تم اس کا پارٹ
لے رہی ہو۔ کیا رشوت مل گئی ہے ذرا عینک لگا کر دیکھا کرو [illegible] کھیل کا مزہ تو کرکرا نہ
کیجئے۔ تم چپ نہ ہوگی۔ کس نے کہا ہے تم سے [illegible] معاملے میں دخل اندازی کرنے کو۔ عجیب مصیبت
ہے۔ خدا جھوٹا کسی کو نہ بنائے۔ میں تو [illegible] کبھی بعض دفعہ جھوٹوں سے بدتر ہو جاتا ہوں۔ طرفہ صاحبہ کیا
کچھ کم ہیں۔ خیر کھیل تو کیا دیکھا جاتا [illegible] طرح طرح [illegible] پاس ہوتے ہوئے مگر ایک لفظ نہ
"بول سکا۔ قدرت نے ایک ساتھی جو دے دیا تھا۔ جو آپا کا ہی ہم جنس تھا

رات کو نیند نہیں آئی۔ نہ معلوم کیسا جذبہ تھا خواہ مخواہ ہی دماغ میں شگفتہ گھوم جاتی تھی۔ سوچا کہ افسانہ
ہی پورا کر لوں۔ مگر جو لکھنے بیٹھا تو ایک لفظ نہ لکھا گیا۔

کالج بند ہوگیا تھا۔ بیکاری کے دن کاٹے نہیں کٹتے تھے آپا سماں جانے کو کہتیں گھر میں روک لیتا۔

ایک دن آپا بڑے پیار سے بولیں۔ ہماری بیڈمنٹن کی چڑیا ٹوٹ گئی ہے آج لا دو۔ اور ہاں تمھیں بھی کھیلنا
پڑے گا۔ دیکھئے تو آپا! مگر یہ تو عورتوں کا کھیل ہے" بڑا ناز ہے اپنے مرد ہونے پر۔ شرم نہیں آتی بڑوں کے سامنے
یہ کہتے ہوئے ـــ" تو یہ آپا کے سامنے تو منہ کھولنا ہی گناہ ہے۔ اب جو بیڈمنٹن کھیل کر واپس لوٹا کمرے کا
عجیب عالم نظر آیا۔ جوتے میز پر تھے۔ فریم پر میرے فوٹو کے بجائے ایک جلتی بکا ڈراؤنا سا چہرہ لگا ہوا تھا۔
بستر پانی سے تر تھا۔ گلدانوں میں سگریٹ کے ٹکڑے ... ہر چیز میں بھونچال آیا ہوا تھا۔ یہ آپا کی ہی کارستانی
ہوگی۔ اگر میں ان کے کمرے میں چلا جاتا ہوں تو بس قیامت آ جاتی ہے۔ اس دن میں نے گلدان سے
پھول توڑ لیا تھا کیسی بگڑی تھیں ... بڑے ہونے کا طعنہ دیا تھا۔ کتنی محنت سے تو گلدستہ تیار کیا تھا تو
تم نے بگاڑ دیا۔ کچھ ڈھنگ بھی ہے کسی بات کا؟ میں نادم ہو کر چلا آیا تھا۔ اب میرے کمرے کا کیا حلیہ بنایا
ہے۔ میں غصے میں آپا کے کمرے میں گیا۔ ہر چیز کو ایسا خراب کروں گا کہ وہ بھی یاد رکھیں گی۔ کیسا صاف
اور سجا رکھا ہے اپنا کمرہ۔ غصہ میں میز کی طرف بڑھا۔ میز پر کتاب رکھی ہوئی تھی سرورق پر کھلے ہوئے
حسین پھول کے وسط میں نام لکھا تھا "شگفتہ" سب غصہ رفو ہو گیا۔ بے اختیار دل چاہا کہ کتاب کھولوں
بغیر اجازت کسی کی چیز دیکھنا بھی تو بدتہذیبی ہے۔ کوئی تھا نہیں اس لئے کتاب جو کھولی تو تعجب سے
آنکھیں کھلی رہ گئیں اس میں میرا فوٹو ... بھی نکالا گیا تھا۔ اب سوچ میں پڑ گیا "میرا فوٹو لینے کا مطلب
کیا ہے آخر۔ میں آیا تھا ... ہونے ... سب میں بھول گیا۔" خدا کا شکر اظہار بھی ادھر سے
ہی ہوا۔ اب سوچا کہ ... کو ... کر دوں گا سب رہ جائے گی آپا کی بہادر بننے کی شیخی۔

چاندنی رات تھی۔ آپا اپنی سب سہیلیوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ میں جھاڑیوں میں چھپ
کر بیٹھ گیا ایک سایہ بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔ میں نے جھپٹ کر پکڑا۔ خیال تھا کہ آپا ہوں گی۔ شانے جھنجھوڑ کر
چلانے لگا "ہاؤ ـــ ہاؤ ـــ" جو نگاہ پڑی تو کاٹو تو خون نہیں یہ شگفتہ تھیں۔
جھاڑی سے دوپٹہ سلجھا کر دیا۔ "چاندنی رات، شگفتہ اور میں ـ" کتنا اچھا موسم ہے۔ میں مسکرا پڑا۔
جرأت سے پوچھا۔ دیکھئے آپ نے میری تصویر کیوں لی ـــ" "میری مرضی" کہہ کر بھاگ گئیں۔ پیچھا کرنا چاہا تو
آپا سامنے آ رہی تھی۔ میں رک گیا۔

آپا اپنا البم دیکھ رہی تھی۔ میں نے آپا کی خوبصورت سی تصویر کو دیکھ کر کہا "یہ مجھے دیدیجئے" کیا کرو گے
میری تصویر لے کر؟ ـــ حسب عادت ٹیڑھا سوال کیا۔ "میرا دل چاہ رہا ہے۔ یوں یادگار کے طور پر"
"شکل تو دیکھئے جناب کی اور چلے ہیں میری تصویر لینے" یادگار کی آ گئی مگر آپا کسی طرح دینے پر رضامند نہ

اختر اورینوی

رقصِ شرر

محبوب نگر سے قریب دامودر ندی سے سات میل دکھن کالندی نامی ایک اڑاؤں گاؤں تھا۔ اس بستی
میں اڑاؤں قبیلہ کے علاوہ کچھ منڈا قبیلہ کے لوگ بھی بستے تھے۔ کچھ شمال سے آئے ہوئے مسلمان جولاہے اور نچی ذات
کے ہندو بھی تھے۔ اڑاؤں اور منڈا قوموں کے چند گھرانے عیسائی مشنریوں کے زیر اثر آکر عیسائیت قبول کر چکے تھے
لیکن اڑاؤں اور منڈا آبادی عناصر پرست تھی۔ وہ بھوت پریت اور ارواح پر ایمان رکھتی تھی۔ جادو ٹوٹکے اور
ہوشیارانہ تحریمات ان کے عقیدہ میں داخل تھیں۔ یہ چھوٹا گاؤں دیودار کے ایک گھنے جنگل کے پاس آباد تھا بلکہ
جنگل اسے اپنی آغوش میں لئے ہوئے تھا۔ بستی کے اردگرد 'موہرم' کے سرخ ٹیلے تھے۔ جن کا ڈھلوان کھیم
پاس تھا۔ یہ نشیب ایک زرخیز "دون" تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ جس کی مٹی سرخی مائل زرد تھی اور جس میں بستی
کے کسانوں کے دھان کے چھوٹے چھوٹے کھیت تھے۔ 'دون' ایک بڑے سے جام کی طرح گنبد فلک
کی طرف نگراں تھا۔ اس کے چاروں طرف 'موہرم' کے ٹیلے سر اٹھائے تھے۔ مغربی ٹیلے کے بعد سیاہ و سفید چٹانوں کا
سنگستان تھا۔ سپاٹ، گول، نوکیلی چٹانوں کے وسط سے ایک چھوٹی سی ندی بہتی تھی۔ ندی کے دامن میں بھی
چٹانیں اور بڑے بڑے سنگ ریزے تھے۔ ندی کبھی کبھار ہی برسات میں بھرتی تھی۔ پہاڑی ندیاں جوانی کے
جذبات کی طرح چڑھتی اور پھولی سمائی ہوئی محبت کی مانند اتر جاتی ہیں۔ صرف رواں دواں سرکوش دھارے
کی گزرگاہ کے نشاں رہ جاتے ہیں۔

بستی کے سب مکان کچی مٹی کے تھے۔ ایک دو کھپریلیں تھیں۔ ورنہ عموماً پھونس اور جنگلی گھاسوں اور
سرکنڈوں کے چھپر ہر جگہ نظر آتے تھے۔ گاؤں والے، ان کے مویشی، ان کے سور اور مرغیاں سب ایک ساتھ ایک
کنبہ کی حیثیت سے رہتے تھے۔ گاؤں کے بچے اور کتوں اور سوروں کے پلّے گلیوں، میدانوں اور ٹیلوں پر ایک ساتھ
کھیلتے رہتے تھے۔ بستی والوں کا پیشہ صرف کاشتکاری تھا۔ بعض بکریاں اور سور پال کر گزارا کرتے تھے۔
کیونکہ 'دون' کے اندر کھیتی کے لئے زمین محدود تھی۔ دھنی ماما نے اس سوریا کی طرح تھے زیادہ بچے جن دئے

بھی بجھا دیا جاتا تھا۔ سارا گاؤں جھاڑ کھنڈ کی قدیم تاریکیوں میں گم ہو جاتا۔ سورج کے چراغ کے گُل ہوتے ہی
ازلی ابدی، ناقابلِ تسخیر ظلمتیں بیکراں اٹل، زندہ و پائندہ جنگلوں سے سر نکال کر بے حقیقت انسا
آبادیوں کو نگل جاتیں۔ یوں تو دن کو بھی جنگل اپنے پنجے نکالے ہوئے ہر طرف سے آدمی کے مسکن کو دبوچ لینے کی فکر م
رہتا۔ مگر رات کے کالے جادو کے جاگتے ہی سارے مورچے سر ہو جاتے۔ افسوں پھونک جاتا، چھوٹے چھوٹے گاؤ
تحلیل ہو ہو کر جھاڑ کھنڈ کی بے پایاں وحشت میں ہضم ہو جاتے۔ صبح ہوتے ہی پھر جنگل اور آدمی کی جنگ شروع ہو
آدم اور جن کی جنگ۔ زراعت اور خود رو، وحشی بے پناہ روئیدگی کا ازلی پیکار۔ تہذیب کی ابتدائی کرن جھا
کھنڈ میں بھی پھوٹتی ہے۔ بہت ہی ابتدائی، بہت ہی کمزور، بہت ہی غیر محفوظ۔ یہاں ہلکی سی روشنی کی نازک
کرن ہمیشہ، غیر مختتم ظلمتوں سے لڑتی رہتی ہے اور تہذیب کے مراکز اس کی کوئی مدد نہیں کرتے۔ بلکہ خود وہ
اس ننھی کرن کو مٹانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ ہوسِ استحصال اور حرص بعض آدمی بھی جن بن جاتے
اخوان الشیاطین یا ذریات شیاطین انسانیت اور بربریت کی لڑائی میں وہ دشمن کی صف میں ہوتے
ان کے دلوں، ان کے دماغوں، ان کے نفس میں ایک اندھیرا جنگل ہوتا ہے جس میں ریچھ، بھیڑیے اور چیتے
ہیں۔ آدم اور جن کی جنگ، انسان اور شیطان کی جنگ ہمارے وجود کے اندر اور باہر ہر گھڑی اور ہر جگہ جا
ہے۔ یہ جنگ کالندی میں بھی جاری تھی۔

اکثر رات کو گاؤں میں ناچ ہوتے تھے۔ جاڑوں اور منڈا فصلوں کے موسم میں ناچ گاؤں کے اندر یا
کسی بڑے درخت کے نیچے سبھا سجتی تھی اور ناچ شروع ہو جاتا تھا۔

چاروں طرف سانس لیتے ہوئے تاریک جنگل اور سائیں سائیں کرتے ہوئے اندھیرے، عفریتی
نشیب و فراز میں رینگتی ہوئی سیاہیاں۔ بستی کے قریبی ماحول پر منڈلاتے ہوئے سیاہ سائے اور ہر سو لامتنا
ہُو کا عالم۔ ابلتی ہوئی پُر رمز خاموشیاں۔ تاریکی خاموشی کے ساتھ ہم آغوش ہو کر اسی ان بولی میں سرگوشیاں کر
ہوتی اور اس ساری سحرناک ابدیت کو ڈھانپے ہوئے گہرا نیلا آسمان اپنے ستاروں کی کرنیں اپنے د
میں ہی سمیٹے ہوئے اپنی ازلیت کا راز اپنے کہن سال سینہ میں چھپائے، اور حیرت فزا ما فوق الفطری تاثرا
و ممکنات اپنے اُس سُسے مگر اٹل بغل میں لئے ہوئے۔ تاریکیاں خاموشیوں کو گہرا کرتیں اور خاموشیاں تاریکی

کو ہمکنار بناتیں۔ ازلیت اور ابدیت گلے مل کر عجیب کائناتی رقص شروع کر دیتیں۔ زندگی کا رقص یا موت کا رقص؟ کون جانے؟ ایسے میں جب آسمان کے چراغ گل ہوئے چار گھڑیاں بیت چکی ہوتیں اور تاروں کی لرزاں روشنی اس جہان کی امرت ظلمتوں کو صرف آہ آگیں کر کے دور سے سہمی ہوئی تماشہ دیکھتی" گاؤں کے کسی جھونپڑے سے ایک کانپتا ہوا دیا نکلتا۔ کھلی فضا میں سفر کرتا ہوا کسی خاص درخت کی جڑ پر آ ٹھہرتا۔ اپنی کومل جوت جگاتا۔ پیچیدہ جڑوں اور تنوں کے ایک آدھ گوشے کو چمکاتا۔ نزدیک کی شاخوں اور پتوں پر مٹیالی سی روشنی ڈالتا، ٹمٹماتا اور جھلملاتا رہتا۔ دیا کی روشنی کا حلقہ عظیم تاریکیوں کے جسم پر سسکتا ہوا ایک زرد دھبا نظر آتا۔ حقیقت دھبا معلوم ہوتا۔ یہ دیا اندھیرا دور کرنے کے لئے شاید نہیں جلایا جاتا بلکہ محض ایک مرکز، ایک علامت، ایک تسکین کی حیثیت سے روشن کیا جاتا تھا۔

سیاہ چمکدار چہرے اور لچکیلے پیکر پیڑ کے نیچے جمع ہو جاتے۔ نوخیز لڑکیوں اور رسیدہ عورتوں کی ٹولی الگ ہوتی اور نوجوان لڑکوں اور ادھیڑ سال مردوں کی علیحدہ۔ دن بھر کی کڑی جاں سوز محنت کے بعد مسرت کے ان گنے چنے لمحات پر تصرف کرنے کے آرزو مند اپنے دلوں کو مہوا یا چاول کی شراب خانہ ساز سے بھگو دیتے۔ آمادۂ رقص ہوئے۔ صنف نازک کا ایک نیم دائرہ بنتا جس کے مرکز میں مرصع زلفوں، سجیلی آنکھیوں، سینہ تاب بازوؤں والے گٹھیلے لنگوٹی پوش جوان گلوں میں ڈھول ڈالے پرے جمائے کھڑے ہو جاتے۔ عورتیں اونچی اونچی ساریاں پہنے بال سجائے۔ آنچلوں سے کولھے اور کمر کسے نیم عریاں ایک منظم حلقے میں پہلو بہ پہلو پھلدار پیڑوں کی طرح استوار کھڑی ہوتیں۔ ان کے سڈول بازو، گدرائے ہوئے سینے بندھی ہوئی پنڈلیاں، تڑپتی ہوئی کمریں اور جوش آہنگ بھرپور کولھے۔ منجمد ترنم، مقید رقص، متشکل نغمگی اور متعین تموج کی تنخواہ ساماں کرتے۔ اچانک ایک سنگیت کا راگ سکوت کو تراشتا ہوا بلند ہوتا نرم، نازک، رسیلا، مگر تیز اور براق۔

"کوڑے ڈنڈیں پاڑا کو پاڑو، پیچ بالرائے راگے ترنو۔ رے۔ رے۔ رے۔ بیری بٹریا پاڑا کو پاڑو، پیچ بالا راگے ترنو۔ رے۔ رے۔ رے (او گیت گانے والے، پیارا سا نغمہ چھیڑ دے! مرنے ہوؤں کی روحیں ٹہلنے آتی ہیں۔)

جوان ڈھول پر تال لگائے اور اس کے گت پر عورتوں کا مرتب و منظم نیم دائرہ قدم ملاتا ہوا آگے

دوبدھے کی اذیت نہیں۔ یہ فطری اور جبلی قوانین کی طرح اچوک ہیں۔ اس میں ترک و اختیار نہیں۔ اس میں رفتار نہیں۔ ارتقاء کی کٹھن منزلیں نہیں۔ اس میں غمِ سفر نہیں۔ یہ ساکت، اٹل، غیر مبدل، ازلی اور ابدی تھا۔

دھکڑیا گھر میں زندگی بالیدہ ہو کر جوانی کا سانس لیتی ہے۔ شباب کی حیرتوں سے روشناس ہو کر اس کی تازہ کار آعجوبگی میں گم ہو جاتی ہے۔ یہاں حیات کا رازِ تسلسل قائم رہتا ہے۔ زندگی کی خواہشات و مطالبات سے واقف کار نوجوان لڑکیاں اور لڑکے دوسری نوخیز ہستی کو نہایت اہتمام و باضابطگی کے ساتھ رازہائے زندگی سے آگاہ کرتے ہیں۔ ہر دھکڑیا گھر کی کچھ رسمیں، کچھ معمولات، کچھ پرستشیں اور کچھ تحریمات ہوتی ہیں۔ ایک رسم یہ بھی ہے کہ گاؤں کے مردانہ دھکڑیا گھر کے اہالیان رات بھیگنے کے بعد جنس کی پوجا کے لئے نکلتے ہیں۔ یہ سیرِ شبانہ دور کے کسی گاؤں تک انھیں لے جاتی ہے کیونکہ اپنی بستی کے زنانہ دھکڑیا گھر پر شبخون مارنا ان کے یہاں ممنوع ہے۔ ان یلغاروں میں کبھی دو گاؤں کے نوجوانوں کی آپس میں مڈبھیڑ بھی ہو جاتی ہے اور خون خرابہ تک نوبت پہنچتی ہے۔ نوجوان مہوے اور چاول کی شراب پیے چیتے کی طرح جنسی شکار میں نکلتے ہیں۔ بڑی احتیاط سے اپنا مقصود حاصل کرنے کی دوادوش کرتے ہوئے اکثر کامیاب اور کبھی گھائل ہوتے ہیں۔ لڑکیاں بھی حد درجہ سپردگی و تمنا سے آنے والوں کے لئے اپنے دھکڑیا گھروں سے پیغامات بھیجتی رہتی ہیں۔ تہذیب کے حملوں سے پہلے اسی ادارہ کے ذریعہ لڑکے لڑکیوں کے جوڑے بنا یا کرتے تھے اور کبھی لغزشوں سے خمیازے بھی بھگتنے پڑتے تھے۔ اگر زنانہ دھکڑیا گھر کی کوئی مستیر طبیعہ عورت کی عجیب عجیب جڑی بوٹیاں، حیرت ناک ٹوٹکے اور کالے جادو جاننے والوں کو سہارا دیتیں میں ناکامیاب ہو جاتے تو پھر خون کے چھینٹوں سے تقدیس کے دیوتاؤں کی پیاس بجھائی جاتی۔ کبھی حبیب قتل کر دیا جاتا اور کبھی محبت شعار و ایثار پسند محبوبہ اپنے حبیب کا نام بتانے سے انکار کر دیتی اور محبت و شباب پر قربان ہو جاتی لیکن اب جھارکھنڈ میں خالص قدیم رسم و رواج نہیں رہے۔ ابتک تو بیرونی درآمد نے اس علاقے کو زیادہ نقصان ہی پہنچایا ہے۔ دھکڑیا گھر کو بھی خارجی بدعنوانیوں کی چھوت لگ گئی ہے۔

(ناول تعمیر کا ایک باب)

مختار الدین آرزو

تنقید

اشعار میر پہ ایک نظر

دنیائے شاعری میں استاد الشعراء میر تقی میرؔ کو جو درجہ اور مرتبہ حاصل ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا جا رہا ہے ان کی شاعری کی عظمت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ان کا دیوان کئی بار شائع ہو چکا ہے جامعہ ملیہ نے نورالرحمٰن صاحب کا اور انجمن ترقی اردو نے مولانا عبدالحق کا ایک انتخاب شائع کیا ہے اور کچھ دن ہوئے لولکشور پریس سے مولانا عبدالباری آسی مرحوم نے ان کا مکمل کلیات بھی مرتب کر کے شائع کر دیا ہے

لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ غالبؔ اور اقبالؔ کی طرح ان پر مستقل کتابیں یا کہا چاہیے بہت کم لکھی گئی ہیں جس کے وہ مستحق تھے۔ اور جو چیزیں لکھی بھی گئی ہیں وہ کچھ اعلیٰ معیار کی نہیں ہیں

زیر نظر کتاب میں متعدد عنوانوں کے تحت ان کی زندگی اور ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میرؔ کے علاوہ ان کے معاصرین اور ان کے تلامذہ کا بھی ذکر ضروری سمجھا گیا ہے۔ میر کے حالات یک گونہ تفصیل سے لکھے ہیں ان کے کلام پر تبصرہ کیا ہے اور آخر میں ان کے کلام کا انتخاب بھی ساتھ دیا گیا ہے لیکن ساری بحثیں پھیلا کر نہیں لکھی گئی ہیں بعض جگہ یہ اس قدر مختصر ہے کہ مصنف کا نقطۂ نظر سمجھنے میں بڑی دقت ہوتی ہے مصنف نے اس کتاب کے لکھنے میں بہت کم محنت کی ہے اور انتخاب اشعار تو اس سے کہیں بہتر ممکن تھا۔

کلام پر جو تنقید کی گئی ہے اس کا پایہ بھی ملند نہیں کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف

۔ کے پاس چند کتابیں ہیں جن کی مدد سے ایک رات میں بیٹھ کر پوری کتاب مرتب کر ڈالی گئی ہے۔ عزیز الدین بلخی کے تذکرے سے خاص طور پر فائدہ اٹھایا گیا ہے میر کے معاصرین پر جو حصہ لکھا ہے اس میں، رکن الدین عشق، ہیبت قلی خاں حسرت، میر محمد باقر حزیں، کے حالات میں بعض مقامات پر جملے کا جملہ اور سطر کی سطر وہیں سے ماخوذ ہے۔ اشعار بڑی بے پروائی سے نقل کئے گئے ہیں اکثر مقامات پر تصحیف اور دوسرے اغلاط موجود ہیں۔ ایسی علمی کتاب کے لیے جس ۔ ۓ کی زبان اختیار کرنی چاہیے تھی اس کا بھی فقدان ہے لیکن سب سے زیادہ افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ کتاب تحقیقی طور پر پایۂ اعتبار سے ساقط ہے اور یہ کتاب کا کمزور ترین حصہ ہے ان صفحات میں کتاب کے سارے پہلوؤں پر روشنی نہیں ڈالی گئی ہے، صرف تحقیقی نقطۂ نظر سے کتاب کو جانچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس قسم کے سارے اغلاط کو سمیٹنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے لیکن اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ کوئی اہم بات لکھنے سے رہ نہ جائے۔

مؤلف نے میر کی ولادت کا ۱۱۳۷ھ بتایا ہے یہ صحیح نہیں میر کے سال ولادت میں اختلاف ہے زمانۂ حال کے اکثر تذکرہ نگاروں نے ۱۱۲۴ء سال ولادت بتایا ہے سر شاہ سلیمان بعض قرائن کی بنا پر ۱۱۳۶ھ کو مناسب سمجھتے ہیں لیکن اب میر سے متعلق کچھ نئی تحقیقات ہوئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سال ولادت ۱۱۳۵ھ ہے ان کے والد کا نام علی متقی بتایا ہے تعجب ہے کہ ذکر میر کی اشاعت کے بعد بھی مؤلف نے یہ غلطی کی ہے۔ خود میر لکھتے ہیں۔

"خواجہ محمد باسط کہ برادر زادہ صمصام الدولہ امیر الامرا بود عنایتے کمال من کرد و پیش نواب برد چوں مرا دید پرسید ایں پسر کیست گفت از میر محمد علی است" (ذکر میر صفحہ ۶۲)

پھر لکھتے ہیں

"جوان صالح عاشق پیشہ بود۔ دل گرمے داشت بخطاب علی متقی امتیاز یافت" (ذکر میر صفحہ ۵)

ان بیانات سے معلوم ہوا کہ علی متقی میر کے والد کا لقب تھا اور محمد علی نام، لقب وعلم میں فرق ضرور کرنا چاہیئے۔

یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ میر صاحب شیعہ تھے ان کے والد کے متعلق تذکروں میں مرقوم ہے کہ وہ سنی اور پرہیزگار زاہد اور عالم باعمل تھے۔ ان کے والد کا ایک سنی صوفی بزرگ حضرت کلیم اللہ آبادی سے مرید ہونا اس کا کھلا ہوا ثبوت ہے میر صاحب ایک وسیع المشرب آدمی تھے کبھی کبھی درگاہوں کی زیارت بھی کر لیتے تھے ایک مرتبہ جب وہ قصہ سامر کی لڑائی میں نواب کے ساتھ شریک تھے تو اجمیر وہاں سے قریب تھا زیارت کے لیے فوراً وہاں چلے گئے

"من پس از صلح برائے حصول سعادت درگاہ فلک اشتباہ خواجہ بزرگ رفتم"

مؤلف نے میر کے صرف ایک لڑکے کا ذکر کیا ہے ان کی ایک بیٹی اور دو بیٹے تھے میر عسکری عرف کلو میر تھے۔ دوسرے میر فیض علی عرف فیض ان کے کچھ شعر بھی تذکروں میں ملتے ہیں ایک تذکرہ سے پتہ چلتا ہے کہ میر صاحب کی صاحبزادی بھی شاعرہ تھیں اور بیگم تخلص تھا۔

مولف نے صرف سال وفات لکھنے پر قناعت کی ہے تاریخ نہیں بتائی۔ ہم اس کمی کو پوری کئے دیتے ہیں میر صاحب ربیع الثانی کے مہینے میں بستر علالت پر گرے زمانۂ مرض الموت طویل تھا چھ ماہ بیمار رہے آخر سنبھل نہ سکے اور جمعہ کے روز ۲۰ ماہ شعبان کو شام کے وقت ۹۰ برس کی عمر میں لکھنؤ کے محلہ سٹی میں داعی حق کو لبیک کہا اور بروز شنبہ ۲۱ ماہ شعبان بوقت دوپہر اکھاڑہ بھیم میں دفن

کیے گئے۔ ان کا مزار عیش باغ میں ہے جو وہ اکھاڑہ بھیم میں اپنے اقربا کے ساتھ دفن کیا
میر کو واسوخت کا موجد لکھنا صحیح نہیں میر سے پہلے آبرو کا واسوخت موجود
ہے آبرو میر سے مقدم ہیں۔ میر کا سال وفات ۱۲۲۵ھ ہے اور آبرو کا صحیح قول کی
بنا پر ۱۱۴۶ھ دونوں میں ۸۰ برس کے قریب کا فرق ہے۔ مثنویوں کی فہرست بھی
ناقص ہے مصنف نے ان کی ۱۱ مثنویوں کا ذکر کیا ہے اٹھارہ مثنویوں کا ذکر تو آزاد
نے کیا ہے سر شاہ نے ان کی ۲۴ مثنویوں کا انتخاب چھاپا ہے ان کا یہ قول بھی صحیح
نہیں کہ میر کی مثنویوں میں کوئی مافوق العادت عنصر کار فرما ہے اور اس غلطی کی وجہ
یہ ہے کہ انھوں نے بقول خود اپنے حافظہ پر اعتماد کیا ہے۔

مزید کہا ہے کہ میر نے مرثیے بغرض ثواب لکھے اور اسی لیے ان میں مرثیہ
گویوں کی خوش اسلوبی نہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے پیش نظر ابھی تک کلیات
میر کے قدیم نسخے ہیں میر کے دوسرے جدید مرثیوں کی دریافت کی شاید انھیں خبر
نہیں اور پھر وہ خوش اسلوبی سے معلوم نہیں کیا مراد لیتے ہیں کیا وہ چاہتے ہیں کہ
میر کے یہاں انیس جیسی زبان اور ادا ہو۔ مؤلف نے لکھا ہے کہ بقول سودا میر
کے مرثیے شاعرانہ حیثیت سے بہت پست ہیں ہم بہت ادب سے پوچھنا چاہتے ہیں
کہ مؤلف کو سودا کا یہ قول کہاں سے ملا؟

مؤلف نے تلامذہ میر کے عنوان سے میر کے چند تلامذہ کا حال لکھا ہے۔ اول تو
اس کی چنداں ضرورت نہ تھی اور اگر ضرورت سمجھی ہی تھی تو فہرست کو مکمل اور صحیح
بنانے کی کوشش کرنی تھی۔ فہرست بالکل نامکمل ہے۔ میر کے بعض تلامذہ کا قطعاً ذکر نہیں
اور ساتھ ہی ساتھ کچھ ایسے شاعروں کا ذکر کر دیا ہے جو درحقیقت میر کے شاگرد نہ تھے۔
بعض شعرا کے جو ترجمے لکھے ہیں وہ صد درجہ ناقص ہیں بہت سی اہم باتوں کا قطعاً ذکر
نہیں کیا ہے ان کا یہ مختصر سا بیان بھی اغلاط سے بھرا پڑا ہے:

نثار کا نام میر عبد اللہ نہیں، میر عبد الرسول ہے خدا کے بندے اور رسول کے بندے
میں بڑا فرق ہے دیکھیے مصحفی کا تذکرۂ ہندی صفحہ ۲۵۴ قاسم کا مجموعہ نغز صفحہ ۲۵۹
قائم کا مخزن نکات صفحہ ۶۲، شفیق کا چمنستان شعرا صفحہ ۳۱۲، خلیل کا گلزار ابراہیم
صفحہ ۲۴۲، حد یہ ہے کہ خود میر بھی یہی لکھتے ہیں دیکھیے نکات الشعرا صفحہ ۱۴۳، میر
کے حالات لکھنا اور نکات الشعرا سے منہ موڑنا بڑی جسارت کا کام ہے۔

مرزا آغا حسین برہنہ لکھنوی کو جلوۂ خضر کے حوالے سے میر کا شاگرد لکھا
ہے جلوۂ خضر مستند تذکرہ نہیں جب تک کہ کسی معاصر تذکرے سے اس کا ثبوت
نہ ملے میر کی شاگردی تسلیم نہیں ہو سکتی اس سلسلہ میں ہم مؤلف کو ریاض الفصحا
دیکھنے کی دعوت دیتے ہیں مصحفی کا بیان ہے کہ برہنہ سودا کے شاگرد تھے[1]

یہی حال باقر علی وحشت کا ہے کوئی معاصر تذکرہ نگار انھیں میر کا شاگرد
نہیں بتاتا، جلوۂ خضر کا بیان قابل اعتنا نہیں، وحشت کا ذکر مصحفی کے تذکرے
میں موجود ہے انھوں نے بھی میر کی شاگردی کا ذکر نہیں کیا ہے۔ نثار کا نام محمد
نہیں محمد اکرم ہے دیکھیے تذکرۂ مصحفی صفحہ ۱۲۵ گلزار ابراہیم صفحہ ۲۱۴

بندرابن راقم کی شاگردی میر کے بارے میں مؤلف نے ایک غیر مطبوعہ
کمیاب تذکرے سے بہت کمزور اقتباس پیش کر کے استفادہ کیا ہے کہ شوق کا بیان ہے کہ
انھوں نے بھی میر سے اصلاح لی ہے ہم حیرت میں ہیں کہ نکات الشعرا چھوڑ کر اتنا
دور جانے کی کیا ضرورت تھی خود میر کا بیان ہے "مشق شعر از مرزا رفیع می کرد
قبل ازیں با فقیر نیز مشورت شعری کرد"[2] ہمارا خیال ہے مؤلف نے شوق کا تذکرہ
بھی دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی ان کا بیان گل رعنا سے ماخوذ ہے۔ عشق عظیم آ

---

[1] ریاض الفصحا صفحہ ۵۲ [2] نکات الشعرا صفحہ ۱۴۳

تاریخ کو ہوا۔ اس قیمتی اطلاع کے لیے بھی ہم یاس آروی کے ممنون ہیں کہ انھوں
نے تاریخ لکھ کر حق شاگردی ادا کر دیا ہے۔ ہماری نظر سے یاس آروی کے
فارسی رقعات و مکاتیب کا ایک ضخیم قلمی مجموعہ گزرا ہے۔ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"والحال باید رحلت شیخ غلام علی راسخ متاسف و متحسر کما ینبغی بہ دریافت
رسید کہ تاریخ بستم جمادی الاول ۱۲۳۸ھ روز دوشنبہ بودہ است"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ راسخ کا انتقال ۲۰ جمادی الاول ۱۲۳۸ھ روز دوشنبہ کو ہوا۔
مؤلف نے راسخ کی عمر ... سال لکھی ہے تمام باتوں کی طرح یہ بھی غلط ہے۔

مؤلف نے سودا کا سال ولادت ۱۱۲۵ھ لکھا ہے ہم یقین کے ساتھ اس کی
صحت کا اعتبار نہیں کر سکتے اس لیے کہ سودا کا سال ولادت نہ تو معاصرین نے
لکھا ہے اور نہ قریب العہد تذکرہ نگاروں نے۔ صاحب مخزن نکات نے لکھا
ہے کہ سودا بہادر شاہ کے عہد (۱۱۱۹ھ تا ۱۱۲۴ھ) میں اپنی فوج کے ساتھ دکن
گیا تھا۔ قائم کا یہ بیان اگر صحیح مان لیا جائے تو اس وقت اس کی عمر
کم از کم ۱۷، ۱۸ سال کی ہوگی۔ اس لحاظ سے سن ولادت ۱۱۰۰ھ سے ۱۱۰۳ھ
کے درمیان ہو سکتا ہے۔ میر نے ۱۱۵۵ھ اور ۱۱۶۵ھ کے بیچ لکھا ہے کہ سودا
کی عمر ۵۰ برس کی ہوگی۔ اس اعتبار سے سال ولادت ۱۱۰۵ھ اور ۱۱۱۵ھ
کے درمیان پڑتا ہے یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے لیکن ہمارے خیال میں قائم
کا بیان زیادہ صحیح ہے۔

منظر کا نام عام طور پر ... علی خاں سمجھا جاتا ہے مؤلف نے بھی یہی لکھا
ہے ہم اس کے لیے کوئی ... نہیں کر سکتے ہیں ... ضرور کہیں گے کہ میر پر
کتاب لکھنی اور اس کے تذکرہ نکات الشعرا کی طرف رجوع نہ کرنا میر اور
اس کی کتاب دونوں پر ظلم کرنا ہے۔ میر کا بیان اس معاملے میں بے حد واضح ہے:

"پدر او مرزا جان نام داشت، از فرط شفقت مرزا جان جاناں
می گفت، ازیں سبب بہ ہمیں اسم موسوم گشت"

پھر صفحہ ۳۰۸ پر انعام اللہ یقین کے ترجمہ میں لکھتے ہیں۔
"نام مرزا جانِ جاناں است، و شاعر، جان جاناں بسبقۃ اکثر عوام
نام مرزا را از غلطی جان جاناں می گویند"

قاسم لکھا ہے:-
"اینچہ از زبانش مسموع است، آن ست کہ نام اصلی جان جاناں
ست چہ والدش محمد جان نام داشت، نظر بران جان جاں موسوم
گردانیدہ" (صفحہ ۳۵۵)

شفیق کا بیان ہے:-
"نام والد ماجد او مرزا جان است ازیں جا وجہ تسمیہ او تواں
دریافت"

اثناء ترتیب تذکرہ، شفیق نے مظہر سے ان کا ترجمہ مانگا۔ مرزا ترجمۂ خود
بہ تحریر آوردہ۔ "فقیر جان جاں متخلص بہ مظہر"

خود مرزا کے ایک شعر سے ہمارے قول کی تصدیق ہوتی ہے:

کوئی آزاد کرتا ہے سمجھ اپنے کو ہے ظالم　　　یہ دولت خواہ اپنا مظہر اپنا جان جاں اپنا

یہ بیان بھی صحیح نہیں کہ مظہر، مالوہ میں پیدا ہوئے۔ گردیزی کا بیان ہے
کہ وہ اکبر آباد میں پیدا ہوئے (صفحہ ۱۳۱) قاسمی اور بیل نے بھی یہی لکھا ہے، خود
مظہر نے "نشو و نما در بلدہ اکبر آباد یافتہ" لکھا ہے۔ اسی طرح مظہر کا سال وفات
۱۱۹۴ھ ہے، نہیں ۱۱۹۵ھ ہے، سودا اور قمر الدین منت کے قطعات تواریخ اس کے
مؤید ہیں۔

احسن اللہ خاں بیان دلی ہی میں نہیں پیدا ہوئے جیسا مؤلف نے لکھا ہے شیفتہ
کا بیان ہے اکبرآباد مولد ہے (صفحہ ۵۵) گردیزی کا بھی یہی کہنا ہے (صفحہ ۲۷) مرزا
علی لطف اور علی ابراہیم خاں نے لکھا ہے کہ دلی میں سکونت اختیار کی لیکن
متوطن اکبرآباد تھے (گلشن ہند صفحہ ۷۶) مؤلف نے قائم کا نام قیام الدین علی لکھا ہے
یہ صحیح نہیں۔ میر نکات الشعرا میں حسن تذکرہ اردو میں محمد قائم لکھتے ہیں علی ابراہیم
خلیل عظیم آبادی نے گلزار ابراہیم صفحہ (۱۹۱) میں اور مرزا علی لطف نے گلشن ہند
میں صفحہ (۱۳۳) یہی لکھا ہے مصحفی اور حکیم قاسم قیام الدین ان کا نام بتاتے ہیں
(تذکرہ ہندی صفحہ ۱۷۹، مجموعہ نغز صفحہ ۱۳۱) گردیزی محمد قائم لکھتا ہے کمال اور مکالا سال
و ناسی قائم الدین بتاتے ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ ان کا نام محمد قیام الدین تھا۔ اور
دلائل کو محفوظ رکھتے ہوئے ہم صرف ایک دلیل پیش کرتے ہیں قائم خود اپنے
تذکرے کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

"فقیر مؤلف محمد قیام الدین قائم بعد کوشش بسیار"

ظاہر ہے کہ اپنا نام جتنا نام والا جان سکتا ہے دوسرا نہیں جان سکتا۔ مؤلف
کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ قائم کا سال وفات ۱۲۱۰ھ ہے اس لیے کہ مصحفی کے تذکرہ
ہندی میں ان کی وفات کا ذکر موجود ہے۔ مصحفی نے تذکرہ ہندی کے دیباچہ
میں لکھا ہے کہ اس کی ابتدا تذکرہ فارسی کی تکمیل کے بعد ہوئی۔

"چوں ایں فقیر از تصنیف دو اں فارسی و ہندی و تالیف
تذکرہ فارسی فراغت حاصل کردہ ہم تالیف تذکرہ ہندی در پیش
آمد"[1]

---

[1] دیباچہ تذکرہ ہندی صفحہ ۳

عقد ثریا یعنی تذکرہ فارسی ۱۱۹۹ میں مرتب ہوا "زہے باغ صفا" مادہ تاریخ ہی لیکن وہ اس کے بعد بھی اضافے کرتے رہے چنانچہ مضطر کا حال ۱۲۱۳ میں لکھا گیا ہی۔ سال تالیف سے مصحفی کی مراد ۱۱۹۹ ہی اس بنا پر تذکرہ ہندی کا سال آغاز ۱۱۹۹ یا اس کے کچھ بعد قرار دینا چاہیے یہ تو ہوا سال آغاز سال تکمیل ۱۲۰۹ ہی معلوم ہوا کہ قائم کی وفات ۱۲۰۹ سے بھی پہلے ہو چکی تھی سال وفات قائم میں اختلافات ہیں علی ابراہیم خلیل عظیم آبادی۔ لطف، شیفتہ اور کریم الدین نے ۱۲۱۰ بتایا ہی وتاسی ۱۲۰۷، بلوم ہارٹ انگریز فہرست نگار ۱۲۰۲، لیکن صحیح ۱۲۰۸ ہی ثبوت میں ایک اہم معاصر جرأت کا قطعہ تاریخ ملاحظہ ہو۔ جرأت نے کہی یہ بعد کے تاریخ وفات یکتائی کے ساتھ

قائم منا دشعر ہندی نہ رہی
کیا کیجیے اب آہ!

مؤلف خواجہ احسن اللہ بیان کا سال وفات ۱۲۱۳ھ بتاتے ہیں یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا اس لیے کہ قائم سنہ ۱۲۲۱ھ میں ان کا ذکر ایک زندہ آدمی کی حیثیت سے کرتے ہیں اور آخر میں "سلمہ الرحمٰن" لکھتے ہیں اور ان کی زندگی کی سلامتی کی دعا مانگتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ کم از کم سنہ ۱۲۲۱ تک ضرور زندہ تھے

مؤلف نے سوز کا ولادت سنہ ۱۱۴۳ لکھا ہی ہم پوچھتے ہیں ان کے پاس اس کا کیا ثبوت ہی؟ سوز کا سال ولادت آج تک متحقق نہیں ہو سکا ہی بعض ۱۱۳۳ بتاتے ہیں۔ سوز کے معاصر تذکرہ نگاروں نے ان کا سال ولادت نہیں لکھا ہی۔ آزاد اور ناصر نے لکھا ہی کہ ان کی عمر ۷۰ سال کی تھی لیکن ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ دونوں سوز کے معاصر نہیں بلکہ بہت بعد کے ہیں اب رہا

کہ سال ولادت واقعی کیا ہی تو ہمارا خیال ہی کہ موجودہ مواد کی بنا پر یقین کے ساتھ کچھ کہنا ہمارے لیے ممکن نہیں۔

بیدار کا نام میر محمد بتایا ہی، مصحفی نے میر محمد علی لکھا ہی[1]، یہی صحیح ہی لیکن یہ میر محمدی کے نام سے مشہور تھے۔

مؤلف نے مصحفی کے حوالے سے لکھا ہی کہ انعام اللہ خاں یقین ۲۵ برس کے سن میں مرے" بعض دوسرے تذکرے اس سے زیادہ عمر بتاتے ہیں۔ شفیق نے لکھا ہی کہ ان کی عمر تیس سال کے قریب تھی۔ صحیح یہ ہی کہ اُن کی عمر ۲۹ سال سے کسی طرح کم نہ تھی یہ غلطی مصحفی کے علاوہ دتاسی، کریم الدین، گراہم بیلی صاحب گل رعنا، مؤلف سخن شعرا سے بھی ہوئی ہی۔ شفیق نے حکیم بیگ خاں حاتم کی زبانی لکھا ہی کہ یقین کی عمر ۳۰ سال کے قریب تھی۔ یہ روایت زیادہ صحیح ہی۔ بہ نسبت اور روایتوں کے، کہ اس کا راوی خود دلّی میں یقین سے مل چکا تھا اور وہ اس سے ذاتی طور پر واقف تھا، اس کے علاوہ بھی بعض باتیں ایسی ہیں جن سے اس قول کی تصدیق ہوتی ہی۔ دیوان حاتم کی ترتیب یوں ہی کہ ہر غزل پر تاریخ کتابت دے کر یہ لکھ دیا گیا ہی کہ یہ غزل کس کی غزل پر لکھی گئی ہی۔ چنانچہ دیوان حاتم میں ۸ غزلیں ایسی ملتی ہیں جو یقین کے طرز پر لکھی گئی ہیں حاتم کی یہ غزل ع

خدا کے واسطے کوئی مری فریاد کو پہنچے

یقین کی اس غزل پر لکھی گئی ہی ؎

چھٹے اس زندگی کی قید سے اور داد کو پہنچے　　وصیت ہی ہمارا خوں بہا جلاد کو پہنچے

---

[1] صفحہ ۱۴۱

یہ غزل جیسا کہ حاتم کا بیان ہے ۱۱۵۲ میں لکھی گئی۔ یقین کے سال ولادت کا ہمیں علم نہیں۔ سال وفات پر بھی سب سے تذکرے خاموش ہیں۔ علی ابراہیم خاں خلیل عظیم آبادی، ناسخ اور ناسی نے صرف یہ لکھنے پر قناعت کی ہے کہ احمد شاہ کے زمانے میں مرے۔ احمد شاہ کا زمانہ ۱۱۶۱ سے شروع ہو کر ۱۱۶۷ پر ختم ہو جاتا ہے۔ انگریز فیلن نے سال وفات ۱۱۶۳ بتاتا ہے، مرزا جعفر علی نشتر ۱۲۰۴ لکھتے ہیں جو صریحاً غلط ہے۔ پہلے بیانات بھی زیادہ صحیح نہیں، اس لیے کہ میر، قائم، گردیزی تینوں کے تذکرے عہد احمد شاہ میں لکھے گئے۔ یہ تینوں وفات یقین سے متعلق کچھ نہیں کہتے بلکہ گردیزی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یقین ۱۱۶۵ تک ضرور زندہ تھے۔ صاحب پہلا تذکرہ نگار ہے جو یقین کی موت کی خبر دیتا ہے۔ وہ اس سے متاثر ہو کر قطعۂ وفات بھی لکھتا ہے۔ جس سے ۱۱۶۹ مستخرج ہوتا ہے۔ ہمارے پاس یہ ماننے کے لیے کافی ثبوت ہیں کہ صاحب کا علم بالکل صحیح ہے اس لیے کہ ان کی اس اطلاع کے ذرائع سے ہم بے خبر نہیں ہیں۔ مختصر یہ کہ سال وفات یقین ۱۱۶۹ مان کر اگر یہ قول مرتب ۲۵ سال ان کی عمر کے نکال دیے جائیں تو ۱۱۴۴ ہو جاتے ہیں۔ کیا مرتب کی سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ ۸ سال کا بچہ ایسی غزل کہہ سکتا ہے اور حاتم جیسا جگت استاد ایک بچہ کی غزل پر غزل کہے گا۔ ذیل میں یقین کی غزل درج کی جاتی ہے۔ کیا ۸ سال کی عمر کا کوئی بچہ ایسے شعر کہہ سکتا ہے؟

نہ نکلا کام کچھ اس صبر سے اب نالہ کرتا ہوں — تری فریاد ہی شاید مری فریاد کو پہنچے

نہیں اس غم کے ہاتھوں زندگانی خوش نہیں آتی — کوئی بیدادگر یا رب ہماری داد کو پہنچے

بہار آئی ہے جب سے تب سے رگ بھی تھم نہیں سکتا — دعا اس مشت خوں کی نشتر فصاد کو پہنچے

یقیں تقلید میں سرمت ٹیک پتھر پر آ بس کر — یہ ممکن ہی نہیں ہر سر سر فرہاد کو پہنچے[1]

[1] مقدمہ دیوان یقین ص ۱۹

مرتب ہدایت دہلوی کا سال وفات ۱۲۱۵ سمجھتے ہیں کریم الدین اور گارساں دتاسی نے بھی یہی لکھا ہے لیکن دتاسی ایک بے پروا تذکرہ نگار ہے اور کریم الدین کا بیان ظاہر ہے کہ دتاسی ہی سے ماخوذ ہے بعض تذکرے ۱۲۱۸ھ اور ۱۲۱۹ھ بتاتے ہیں صحیح طور پر کچھ کہنا مشکل ہے سردست ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ۱۲۲۱ھ سے پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا قاسم کا بیان ہے

"از چندے دل از جہانِ فانی برکندہ بر سرائے جاودانی رحل اقامت
افگندہ حداش رحمت کناد و در جوار عنایات مسکن دہاد"

معلوم رہے کہ قاسم کے تذکرے کا سال تالیف ۱۲۲۱ھ ہے۔

آکم کا سال وفات ۱۲۱۵ھ لکھا واضح غلطی ہے مجموعۂ نغز کے مصنف ۱۲۲۱ھ میں "سلمہ ربہ" لکھتے[1] ہیں اس سے یہ ثابت ہوگیا کہ وہ کم از کم ۱۲۲۱ھ تک ضرور زندہ تھے خورشید بلگرامی کا سال ولادت ۱۱۹۵ھ اور سال وفات ۱۲۱۱ھ لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ فارسی اردو دونوں زبانوں میں اشعار کہتے تھے کیا مرتب سمجھتے ہیں کہ ایک چھ برس کا لڑکا اردو اور فارسی میں شعر کہہ سکتا ہے۔

شورش عظیم آبادی کا نام غلام حسین خاں نہیں تھا ان کا تعلق سادات سے تھا عشقی عظیم آبادی نے انھیں سید لکھا ہے اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق نے ۶۰ سال کی عمر میں ۱۲۳۱ھ میں انتقال کیا اور نہ یہ صحیح ہے کہ ان کی تصانیف سے صرف ایک دیوان اور ایک مثنوی ہے۔ مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق عظیم آبادی کی مندرجہ ذیل تصانیف کا اب تک ہمیں علم ہوا ہے ---

(۱) مثنوی: یہ ایک صاف شستہ اردو کی مثنوی ہے جو سحر البیان کے طرز پر لکھی گئی ہے، اشعار کی مجموعی تعداد دو ہزار ہے۔ یہ مثنوی اس نے آخر زمانے میں

---

[1] مجموعۂ نغز صفحہ ۴۱

منظومات

اق گورکھپوری

تلاشِ حیات

اہلِ ہند کے نام سالِ نو ۴۸ء کا پیام

مہر کے گرد یہ زمیں
کر چکی اک طواف اور
قلبِ زماں مکاں میں آج
پڑ گئی اک شگاف اور

جب ان فضا میں بڑھ چلی
سینوں سے وہ اٹھا دھواں
رات کٹی، سحر ہوئی
دوڑ گئیں رگوں میں بجلیاں

گنگ و جمن نے کروٹیں
بدلیں چمکتے دور سے
ہلتی ہیں رات کی لٹیں
موج ہوائے سرد سے

جس پہ گراں جمود تھا
ذرے وہ تلملا اٹھے
جھوم کے چل پڑی ہوا
غنچے بھی مسکرا اُٹھے

ایک چھپی ہوئی لکیر
شرق سے دے رہی ہے لو
کانپتے ہیں کرن کے تیر
چرخ پہ پھٹ رہی ہے پو

خواب سے آبشاروں نے
چونک کے آنکھیں کھول دیں
چشمے اچھل اچھل پڑے
نہریں ابل ابل پڑیں

راہ سفر کے ذروں کو اذنِ حیات دیے چلو
ہاں یوں ہی آنکھوں آنکھوں میں موت کو تو لیے چلو
کون و مکاں کی سرحدیں توڑتے تاڑتے چلو
سوکھی ہیں زیست کی جڑیں اشکوں سے سینچتے چلو
نخلِ مراد کو یوں ہی آبِ حیات دیے چلو
چاند سے کیف، رمزیت رات سے چھینتے چلو
موت کی نیند اچاٹ دو قُم کی صدا دیے چلو
عمق میں بطنِ گیتی کے
حیات ڈھونڈتے چلو

مسل گیا ہے جسم راہیوں سے جو دل تپاں
ہنوز لو سی دے رہی ہیں تا بدن کی بھی چٹکیاں

چمن چمن، عدن عدن کلی کلی، سمن سمن
بسوزِ عشق شعلہ زن بسازِ حسن گل بدن
بہ مشکِ آہوئے ختن بہ رنگ گیسوئے شکن شکن
بہ شیریں و بہ کوہ کن بہ داستانِ دل دہن
بہ نرگس پیالہ زن بہ روئے صاعقہ فگن
بہ ہر نفس و ہر سخن بہ ہائے و ہوئے ما و من
زمیں زمیں، زمن زمن سفر سفر، وطن وطن
بہ پیر ساز و بت شکن بہ ذوقِ شیخ و برہمن
بہ حق بہ کفر شعلہ زن بہ بہرِ خدا و اہرمن
حیات ڈھونڈتے چلو

حیات ڈھونڈنے چلو

صدائے صلح و جنگ میں　　سکوت خاک و سنگ میں
جہان رنگ رنگ میں　　امنگ میں ترنگ میں
جوانوں کی آگ میں　　محبتوں کے راگ میں
لگاؤ اور لاگ میں　　حسینوں کے سہاگ میں
شفق شفق جمال میں　　اڑے اڑے گلال میں
فراق میں وصال میں　　طواف ماہ و سال میں

گھنی پلک کی چھاؤں میں
رسیلی نرم اداؤں میں

خنک خنک ہواؤں میں　　ستاروں کی سبھاؤں میں
دھواں دھواں گھٹاؤں میں　　کھلی کھلی فضاؤں میں
اندھیری گھپ گپھاؤں میں　　جو ڈس لیں ان بلاؤں میں

حیات ڈھونڈنے چلو
حیات ڈھونڈنے چلو

افق افق حسینوں میں
چراغ پاش سینوں میں

چمن چمن حسینوں میں　　جہاں کے نازنینوں میں
دلوں کے آبگینوں میں　　جبیں کی نرم چینوں میں
زمین کے دفینوں میں　　دل فلک کے کینوں میں

اندھیری کائناتوں میں
سیاہ پوش راتوں میں

جمال مہ جبیناں و عشوۂ ستارہ بار میں
سرکتے کھنچتے کا ہکشاں میں شوخی نگار میں
ادا ادا کے گرد ساحت رنگ کی پھوار میں
امنڈتے بول نغمہ کے سکونِ بے قرار میں
جھڑ جاؤ میں اتار میں نشے میں اور خمار میں
ہر ایک کارزار میں ہر ایک جیت ہار میں
حیات ڈھونڈتے چلو
حیات ڈھونڈتے چلو

کلی کی پلکیوں میں
سنبل چمن کے طرہ میں حیات ڈھونڈتے چلو
دھڑکتے قلب قطرہ
اور سانس لیتے ذرہ میں حیات ڈھونڈتے چلو
جہان عنصری کے
کاروبار روزمرہ میں حیات ڈھونڈتے چلو

بھری بھری گھٹاؤں میں فضا کی وہ ادائیں
ڈھلی ہوئی ہوا میں زلف شب کی وہ کہتائیں
سکوت میں کسی کے پائے ناز کی وہ آہٹیں
گجر سے پہلے کائنات کی وہ کسمساہٹیں

لہ میں نے ان قافیوں کو یہاں جائز قرار دے لیا ہے (فراقؔ)

وہ پو پھٹی جبین سحر کی وہ جگمگاہٹیں
وہ رسمساتے گلشن سحر کی لہلہاہٹیں
کچھ اودی بدلیوں میں دھوپ کی وہ مسکراہٹیں
صبوحی بلی کے روشنی لالگوں کی تمتماہٹیں
شگوفہ چھوڑتی جوانیوں کی اچپلاہٹیں
لبوں کی پنکھڑی پہ تاروں کی وہ جھلملاہٹیں
وہ مد بھرے سپنوں کی رسیلی گنگناہٹیں
نگاہ ستمگر سار کی کرن کی لپلپاہٹیں
ردائے روز و شب کی وہ خموش سرسراہٹیں
ہوائے انقلاب کے پروں کی پھڑپھڑاہٹیں
چراغ نظم کہنہ کی اداس تمتماہٹیں
زمین کی تہوں میں زلزلوں کی گڑگڑاہٹیں
نظام کائنات کی رگوں کی سنسناہٹیں

جہاں گگن ہلارے میں اندھیرے میں اجالے میں
دہکتے آگ نالے میں جوانیوں کے ہالے میں
جبینوں کے اجالے میں سیاہ لٹ کے کالے میں

کتھا کلی کے لوچ میں
کلائیوں کی سوچ میں
فضا کی نرم سانس میں
ہر اک کھٹکتی پھانس میں

لبوز قطع و زبان بدر پر سعی رائگاں

یہ ارض اور یہ آسماں — زماں زماں مکاں مکاں
بہ رنگِ سیلِ کارواں — رواں دواں رواں دواں
مثالِ برقِ بے اماں — تپاں تپاں دماں دماں
بسازِ قلبِ عاشقاں — بسوز سینۂ تپاں
بہ سر عیاں بہ سر نہاں — یقیں یقیں گماں گماں
شش جہات و لامکاں — ادھر ادھر یہاں وہاں
بساز دل بسوز جاں — بہ نیک و بد این و آں
بہر تپہ و ہر نشاں — بہ ماندگاں و رفتگاں
بعزمِ عمرِ جاوداں — بہ بزمِ مرگِ ناگہاں

دلوں کی دبکی آگ میں
جنوں کی مڑتی باگ میں
جوانیوں کی آہ میں
جمالِ بے پناہ میں
نگاہِ دل نواز میں
دلوں کے ساز باز میں

نگارِ بے نیاز کی ادائے دلنواز میں دلوں کے ساز باز میں
لجاتے مسکراتے آہوئے بہانہ ساز میں نگاہ نیم باز میں
صد انتشارِ غزنوی و گیسوئے ایاز میں نیاز اور ناز میں
نہ کٹنے والی ہجرِ یار کی شبِ دراز میں دلوں کے سوز و ساز میں
پلک کی اوٹ سے اشارۂ نگاہِ ناز میں جنوں کی ترکتاز میں
جمالِ رنگ رنگ و نرگسِ کرشمہ ساز میں گناہ کے جواز میں

شعاعِ تیز و تند سے فضاؤں کے گداز میں ہوائے بادہ ساز میں
ہر اک کھنکتے ساز میں ہر انکشافِ راز میں حقیقت و مجاز میں
سمندروں کی تہ میں آسمانوں کے فراز میں ہر اک جہانِ راز میں
ہر اک غم اور شادی میں
فراق وادی وادی میں
حیات ڈھونڈنے چلو
حیات ڈھونڈنے چلو

سہمے تارے

شجاع احمد زیبا

لگا وہ تیشہ کہ منہ کھل گیا ہے جھرنوں کا
رگِ سحر سے لہو کی لکیر پھوٹی ہے
جبینِ عرش پہ ہے اژدہام کرنوں کا
افق پہ دور کہیں پھلجھڑی سی چھوٹی ہے

اندھیری رات ۔ مگر اب اندھیری رات کہاں
سمٹ رہا ہے اندھیرے کا بیکراں دامن
فلک پہ ہیں تو ستارے مگر وہ بات کہاں
خزاں کے خوف سے سہما ہوا ہو جیسے چمن

بقائے ذات کی خاطر ہے سب یہ جد و جہد
بقائے ذات کی کب تک کریں گے تاویلیں
نہ کوئی مونس و ہمدم نہ اب کسی کی مدد
سحر قریب ہے بجھنے لگی ہیں قندیلیں

قفس میں ہو گئے بیدار طائرانِ اسیر
الگ ہٹو کہ وہ بجنے لگی سحر کی نفیر

روشن صدیقی

ابھی تو رات بہت ہے

عروس شب یوں ہی مجھکو، ابھی تو رات بہت ہے

علاج غم بھی نہیں کچھ، علاج غم بھی نہ ہوگا
یہ زہر کم بھی نہیں کچھ، یہ زہر کم بھی نہ ہوگا
مگر یہ لمحۂ شاداں کبھی بہم بھی نہ ہوگا

نشاط روح کی اتنا بھی التفات بہت ہے

خود آفتاب کے دل کا لہو کہیں نہ دہے اب تک
متاع سینۂ مشرق شرار سے نہ دہے اب تک
رُخِ سحر پہ یہاں ظلمتوں کی گرد رہے اب تک

اگرچہ شور ہجوم تجلیات بہت ہے

طلوع مہر سے بھی دل میں روشنی نہیں ہوتی
شفق بھی ساقیٔ صہبائے زندگی نہیں ہوتی
نگارِ صبح کے نغموں میں سرخوشی نہیں ہوتی

مگر یہ رات! یہ آرائش حیات بہت ہے

سحر یہ کون؟ یہ کس کی صدا سے چونک اٹھا میں
یہی تو ہے وہ سحر جس سے دور دور رہا میں
کہیں افق سے پکارا کسی نے لو وہ چلا میں
مجھے تو لرزشِ آہنگِ کائنات بہت ہے

تغیرات کی بیگانگی عزیز ہے مجھ کو
نگاہِ ناز کی برہمی عزیز ہے مجھ کو
یہ صبح، صبحِ قیامت سہی عزیز ہے مجھ کو
مرے جنوں کو ابھی یاں تغیرات بہت ہے

مری نوا نے ستاروں کو تیز گام کیا ہے
مرے سکوں نے فرشتوں کو ہمکلام کیا ہے
مری وفا نے مشیت کا احترام کیا ہے
نگاہ ہو تو جمالِ تعینات بہت ہے

مری نگاہ سے بچ کر گزر رہا ہے اندھیرا
ہے میری روح میں شاید نئی سحر کا بسیرا
یہ خونِ دل سرِ مژگاں بنے گا "سرخ سویرا"
یہ ہو سکا تو مجھے فرصتِ حیات بہت ہے

مسعود حسین

خوابِ سنگ

ابھی تو خواب گراں سے اُٹھے ہیں سنگِ گراں
کہ ہوگی سنگِ محبت پہ اک نئی تعمیر

ٹپک رہے ہیں جو اشکوں کے تارے آنکھوں سے
ابھی تو ڈھلیں گے لاکھوں شرارے آنکھوں سے
کوئی بتاؤ چمن والو ان کا حشر ذرا
یہ رنگ و بو کا ہجوم اور گلوں کا جشنِ عبیر

[illegible] ہیں یہ نسرین و [illegible] کے محل
بہار کھیلتی ہے ان میں [illegible] اٹکھیل
وہی بہار جو دولت [illegible] بھاگی ا
کہ رنگ و بو کی ہوئی [illegible] سنگ سے تعمیر ا

یہاں آ کے دیکھو تو کیاری کیاری ہیں
کہیں خیال نے پچکاریاں سی ماری ہیں
صبا کی گود میں مچلی ہوئی ہے نکہتِ گل
چھلک رہے ہیں کٹورے کہ دل ہے آتش گیر

کہیں وہ چہلیں، وہ آپس میں ہوتی رنگ رلیاں
گلوں نے چھیڑ دیا، مسکرا سی دیں کلیاں
وہ برگِ گل کی رسائی پیامِ حیرانی
کہ [illegible] ہے سنگ بھی شش گراں کی یہ تقدیر

وہ ان کی نیم نگاہی وہ قہقہوں کی کھنک
ہر اک خیال کی گودی میں آرزو کی دھنک

تنک تنک کے مچلتے ہیں مے کی بو میں سب
ھر ایک لالہ و گل بن گیا ہے ساغر گیر

جواں قدم کبھی کھاتے بھی ہیں اگر ٹھوکر
تو جیسے خواب کو کوئی بھلا دے پھر سو کر
نظر کمند ستاروں پہ ڈالتی رہتی ہے
فلک پہ کھینچتے ھر دم یہ آرزو کی لکیر!

ستارے ان کی امنگوں سے کب ہیں بالا تر
ھلال ان کے ارادوں کا اک رکاب زر
سمند شوق فلک میں بھی کھولتا ہے در
کہاں کہاں لئے جاتا ہے جذبۂ تسخیر!

وہ شرتیں کہ دہن میں ہے تلخ تلخ نبات
یہی دعا کہ خدایا نہ ختم ہو یہ رات
کبھی چاند سے امواجِ سِفَل تیز کرے
فلک سے برسے جو مہتابیوں کا عیشِ کثیر

وہ ان کی پیار کی باتیں، شبک شبک سے سوال
گراں کتبِ الفت گمان و وہم و خیال
حسین پہ ذکرِ حسیں نام کو ملے نہ کہیں
لہو رگوں کا یہ پی کر بنے ہیں بدرِ منیر

وہ مست، خود کو بھرا آغوش وا میں جو کھو دیں
بھرا بھرا سا ہے جوبن تو کھلکھلا دیں
نہ دل میں رس کی ہیں دھاریں نہ دودھ آنچل میں
ہے نامراد سی تسکیں کا شوق عالم گیر!

کسے خبر تھی کہ ہے اس نوا میں بھی بم و زیر

جواں لہو کی وہ پینگیں، وہ مست انگڑائی
وہ نخوتیں، وہ انانیت، خودی، خودآرائی
تھرکتے دائرے آتے اُتر کے قدموں پہ
رقص ہے عالم تمام اس کا اسیر

وہ گرم گرم لہو، تیز تیز سی سانسیں
وہ بازوؤں کی پھڑک اور کھنچی ہوئی پھانسیں
وہ ضبط اور طلب۔ انہدام و لمس طویل!
خلافِ فلک! کہ ہے سارا جہاں گرہ گیر

بھرے بھی ہیں تو جام کچھ نہ رہنے پائے!
ادھر کٹی ساقیٔ گلفام! کچھ نہ رہنے پائے!
مگر تمہارا نہ ٹوٹیں گی کیا طنابِ عمارت
میں سے کتنا اُٹھاؤ گے عشرتوں کا خمیر؟

x x x x x x x x
x x x x x x x x

کسے خبر تھی کہ اتنے میں چشمِ سنگ کھلی
گلوں کے چاک ہیں سینے، قبائے تنگ کھلی
کلی کا ننھا سا منہ اور وہ بھی نکل آیا!
بدل رہا ہے جہاں بدل رہی ہے خود تقدیر!!

اٹھی تو خوابِ گراں سے اٹھے ہیں سنگِ گراں
کہ ہوگی سنگِ محبت پہ اک نئی تعمیر!

پنڈت جواہر لال نہرو

مسلم یونیورسٹی میں

آپ تقسیم اسناد کے لیے پنڈال تشریف لے جا رہے ہیں

هر ایکسیلنسی سروجنی نایڈو علیگڑھ میں

هر ایکسیلنسی، پروفیسر حبیب اور رشید الدین صاحب کی معیت میں لائبریری سے آرہی ہیں

مغیث الدین فریدی

معذرت

تو مرے ساز کے ٹوٹے ہوئے تاروں کو نہ چھیڑ اپنی معصوم نگاہوں کو گنہگار نہ کر
فطرتِ عشق سمجھ، عشق کے شعلوں سے نہ کھیل میرے سوئے ہوئے جذبات کو بیدار نہ کر

نغمہ کیا، اب کوئی فریاد بھی ہونٹوں پہ نہیں آرزوؤں کا گلا گھونٹ دیا ہے میں نے
اب تڑپتا نہیں پلکوں پہ ستارا بھی کوئی دل کی رگ رگ سے لہو کھینچ لیا ہے میں نے

اے مری شاہدِ معصوم مرے ساتھ نہ چل تیری فطرت میں بغاوت کے عناصر ہی نہیں
مجھ کو چلنا ہے زمانے کی روش سے ہٹ کر رہبرِ عشق ہوں میں، صرف مسافر ہی نہیں

اور تو حلقۂ تہذیب و روایت کی اسیر تو بھلا وسعتِ آغوشِ نظر کیا جانے
تو ستاروں کی خنک چھاؤں میں سونے والی کیسی ہوتی ہے قیامت کی سحر کیا جانے

مجھ کو درکار ہے اک صاعقۂ بردوش نظر ظلمتِ رسم و روایت کو مٹانے کے لئے
مجھ کو درکار ہے وہ حشر در آغوش ادا زلزلہ بن کے جو رہ جائے زمانے کے لئے

تو مرے ساز کے ٹوٹے ہوئے تاروں کو نہ چھیڑ
اپنی معصوم نگاہوں کو گنہگار نہ کر

باقر مہدی

منزل

چمک چمک کے ستاروں نے روشنی کھوئی
مگر حیات کو خوابِ سحر ملا ہی نہیں
الجھ رہے ہیں رہِ شوق ہستی سے دیوانے
محبتوں کا ابھی کارواں بڑھا ہی نہیں
جنونِ عشق کی گمراہیوں سے کیا حاصل
غبارِ دشتِ بشر تو ابھی ہٹا ہی نہیں

سفینہ ارادوں کا حوادث سے کھیلتا ہی رہا۔
مگر ابھی تو نگاہوں سے دور ساحل ہے
چھلک رہے ہیں غمِ آرزو کے پیمانے
بھری بہار میں اجڑی ہوئی سی محفل ہے
بجھی بجھی سی تمنا رکے رکے سے قدم
ہجومِ یاس کے ماروں کی کون منزل ہے؟

غزلیں

حسرت موہانی

دل اُن سے مل کے اب ان کو بھلا نہیں سکتا
مگر یہ کیوں ہے، میں خود بھی بتا نہیں سکتا

بقدرِ حوصلۂ عاشقی ہے شوقِ وصال
مگر وہ شوق جو دل میں سما نہیں سکتا

یہ کس کے عجزِ تمنا کا پاس ہے کہ وہ شوخ
بہ زعمِ ناز بھی دامن چھڑا نہیں سکتا

تری نظر کا ہے ناوک وہ ناوکِ دل دوز
نشانہ کوئی بھی جس کا بچا نہیں سکتا

اُنھیں یقینِ محبت نہیں، غضب تو یہ ہے
کہ چیر کر میں دل اپنا دکھا نہیں سکتا

اگرچہ میں ہمہ تن درد ہوں مگر حسرت
کوئی جو پوچھے، کہاں ہے؟ بتا نہیں سکتا

پرویز شاہدی

سیلاب تبسم بخش گئیں، طوفان تمنا بخش گئیں
ہر قطرۂ خوں دل کو مرے تم تو ترپتا دریا بخش گئیں

ہیجان محبت بخش گئیں، جذبات تمنا بخش گئیں
تم آنکھوں ہی آنکھوں میں دل کو کیا جانیے کیا کیا بخش گئیں

چبھتی سی نظر کی تیغیں پیام خلش کچھ دے ہی گئی
رشک آتا ہے حسن پرستوں کو تم دل کو وہ کانٹا بخش گئیں

دامان نظارہ خالی ہی حسن کا میں رہتا جلووں سے
تم آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ کو وہ چشم تماشا بخش گئیں

بے مست سکوں ... ہوا اک میٹھا سا درد آباد ہوا
دنیا مرے دل کی کیا لوٹی دل کو مرے دنیا بخش گئیں

حالات میں گھیری ... تم نے مجھے آخر لے ہی لیا
جینے کا سہارا کوئی نہ تھا جینے کا سہارا بخش گئیں

تم اپنی جوانی ... کو نکھرا کے ہو ... کے ہونٹوں پر
بے خواب جوانی کو میری اک خواب حسیں سا بخش گئیں

قسمت کے اندھیرے لرزاں ہیں دیواروں پہ تارے رقصاں ہیں
یعنی مرے ظلمت خانے کو تم آ کے اجالا بخش گئیں

... کی رونق کیسے ایمن کی فضا ترساتی ہے
دیوار کے اک اک روزن کو تم دیدۂ موسیٰ بخش گئیں

جاگی کیف پائے نازک ... لگی ہے تاروں سے
یعنی مرے سر کی چوکھٹ کو تم اوج ثریا بخش گئیں

چنگیزی دوراں کا یہ اٹھی جب دور نظر سے تم مجھ کو
اک عزم بغاوت بخش گئیں، اک شوق توانا بخش گئیں

اب سیل بلا سے کون ڈرے جب مجھ کو مرے نزدیک آ گئے
طوفان کی ہمت بخش گئیں، پتھر کا کلیجا بخش گئیں

محسوس تو کرتی ہوگی تم مانا کہ زباں سے کچھ نہ کہو
پرویز کا کیا کیا لوٹ لیا پرویز کو کیا کیا بخش گئیں

وامق جونپوری

[illegible]ن میں شفق کے کوئی تارا تو نہیں
[illegible]یں زریں نے پکارا تو نہیں
دست و پا شل ہیں کنارے سے لگا بیٹھا ہوں
لیکن اس شورشِ طوفان سے ہارا تو نہیں
آکے پھر لوٹ چلی کشتیٔ دل ساحل سے
پھر کسی موجۂ طوفاں نے پکارا تو نہیں
اس غمِ دوست نے کیا کچھ نہ ستم ڈھائے مگر
غمِ دوراں کی طرح جان سے مارا تو نہیں
[illegible] بوندے نہ اٹھے تو سرِ مژگاں آکر
[illegible]ک قطرۂ شبنم ہے شرارا تو نہیں
اک اجالا سا جھلکتا ہے پسِ پردۂ غیب
چشمِ بے خواب میں لرزاں کوئی تارا تو نہیں
[illegible]ے گیتوں سے معمور ہر اک بربطِ جاں
[illegible] آپ کی نظروں کا اشارا تو نہیں
[illegible]شرق میں جو روشن ہیں کئی انگارے
[illegible] کا کوئی ان میں ستارا تو نہیں
امیدوں پہ جیتا رہا وامق اب تک
[illegible]ک یہی جینے کا سہارا تو نہیں

پنڈت رام کشن مضطر

متاعِ درد سے محروم ہے حیات ابھی
[illegible]ی نہیں ہے محبت کی کائنات ابھی
[illegible] تغافل بجا [illegible] اے دوست
نہیں نگاہ میں پہلا سا التفات ابھی
ابھی کچھ اور تغافل کہ اے نگاہِ یار
نہیں ہے دل کو تمنائے التفات ابھی
حیات [illegible] عالم
[illegible] ابھی
ہیں اس نگوں ادائے سپہر سے [illegible]
ابھی سے خوفِ سحر کیا بہت ہے رات ابھی
بنا نہیں غمِ دنیا ابھی غمِ جاناں
غمِ حیات نہیں ہے غمِ حیات ابھی
الٰہی خیر کہیں رازِ غم نہ کھل جائے
سکوتِ یاس نے چھیڑی ہے کوئی بات ابھی
ابھی نظر کو میسر کہاں ترے جلوے
اداس اداس ہے سونی ہے کائنات ابھی
اک انقلاب کا اس درجہ غم نہ کر مضطر
کہ دیکھنے ہیں بہت سے تغیرات ابھی

اس لئے کہ وہ دولت پیدا کرنے کے علاوہ دوسروں کی بیویوں کو کیوں نہیں مار ڈالتا۔ وہ نوکر سے اس لئے جھگڑے گی کہ نوکر تو صرف نوکر ہوتے ہیں، تنخواہ یا معاوضے سے کیا سروکار۔ یہ کھاتے پیتے سوتے جاگتے کیوں ہیں۔ وہ دوسروں کی بیویوں سے جھگڑے گی۔ اس لئے کہ وہ جانتی ہے کہ وہ خود ان کے بارے میں جیسی رائے رکھتی ہے اُس سے کہیں زیادہ تند و تاریک رائے دوسری عورتیں اُس کے بارے میں رکھتی ہیں وہ خدا سے جھگڑا مول لے گی اس لئے کہ خدا کا تعلق دنیا کی عورتوں سے کیوں ہے!

ایڈیٹروں کی کرامات کے بارے میں کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے ایک روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک ایڈیٹر صاحب نے انتقال فرمایا یہاں یہ عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ جس روایت کا میں تذکرہ کرنے والا ہوں وہ بیان کی ہوئی تو ہے ایک ایڈیٹر صاحب کے ہم پیشہ کی لیکن وہ یہی یعنی ان کا انتقال فرمانا ایک ایسی ایجنسی سے ہے جس کا کوئی تعلق پہلے سے نہیں ہے۔ مرحوم ایڈیٹر صاحب کی روح جنت کے دروازے پر پہنچی تو داروغہ جنت نے اس کی پذیرائی کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جنت میں ایڈیٹر کا کام نہیں۔ وہاں سے روح جہنم کے دروازہ پر آئی۔ مالک داروغہ نے بھی اس کو قبول کرنے سے انکار کیا کہ جہنم کسی ایڈیٹر کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

ایڈیٹر صاحب کی روح نے بغیر کسی تکلیف کے جنت اور دوزخ کے درمیان اپنا آفس کھول دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے ہی دن ان کو دو دعوتی کارڈ وصول ہوئے ایک جنت سے دوسرا جہنم سے!

دوسرا قصہ اسی دنیا کا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ایک بستی میں دو اخبارات تھے ایک کا نام کچھو تھا اور دوسرے کا نام بھالا۔ تھوڑے ہی دنوں میں بستی میں کہرام مچ گیا۔ نہ کسی کی جان کی خیر تھی نہ مال کی نہ آبرو کی۔ آخر میں ایک شریف آدمی نے بڑی جد و جہد کے بعد دونوں اخباروں کے ایڈیٹروں کو مدعو کیا تا کہ وہ صلح کر لیں اور بستی کے لوگ حیات مستعار کے کچھ دن امن و عافیت سے بسر کر لیں۔

کچھو کے مدیر مسئول صاحب تشریف لائے۔ ہر حیثیت سے اسم بامسمیٰ تھے۔ اب تلاش شروع ہوئی کہ بھالا کے سمپادک کہاں تشریف رکھتے ہیں۔ بڑی دیر کی جستجو اور دوڑ دھوپ کے بعد کچھو صاحب نے ظاہر فرمایا کہ موصوف ہی بھالا کے بھی ایڈیٹر تھے۔

اس کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اس سعادت مند فرقہ کے بارہ میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے!

جھگڑنا اکثر عمداً یا حماقت کی بنا پر نہیں ہوتا بلکہ محض ایک مشغلہ رہ گیا ہے طور پر۔ جیسے شعر کہنا، حساب لگانا یا ایمرن کھانا۔ ایک زمانہ میں میرا قیام ایک ایسے محلہ میں تھا جہاں دو بڑے میدار تھے۔ مکان کی تقسیم کا جھگڑا تھا۔ یہ جھگڑا ہر منزل سے گذر کر عدالت تک پہنچا اور مکان دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا لیکن جھگڑے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ سورج ڈوبتے ہی ڈیوڑھی کے ادھر اُدھر دو مونڈھے بچھائے جاتے۔ پہلے ایک ملازم ہاتھ میں بڑا سا رومال، دوسرے میں حقہ، دوسرے صاحب برآمد ہوتے ایک ہاتھ میں رومال دوسرے میں پیچوان [illegible] اپنے اپنے رومالوں سے بیٹھنے کی جگہ صاف کی۔ ایک نے اللہ کا نام لیا اور بیٹھ گیا دوسرے نے رقیب کو گالی دی اور بیٹھ گیا۔ ایک نے کہا۔ آداب بجا لاتا ہوں میراں صاحب! دوسرے نے کہا تسلیمات عرض ہے منجھو صاحب۔ اس کے بعد گفتگو شروع ہوئی۔ ۱۵ منٹ تک میراں صاحب نے لفظ سناتے رہے۔ اور منجھو صاحب خاموش سنتے رہے اور حقہ پیتے رہے اس کے بعد منجھو صاحب نے حقہ میراں صاحب کے اور میراں صاحب نے پیچوان منجھو صاحب کے حوالے کی جس کو دونوں نے فرشی سلام کے ساتھ قبول کیا اور دوسرے ۱۵ منٹ تک منجھو صاحب میراں صاحب کو صلواتیں سناتے رہے اور میراں صاحب خاموش سنتے رہے اور حقہ پیتے رہے۔ دو گھنٹے مسلسل میر صاحبان جھگڑتے رہے اور حقہ اور پیچوان باری باری بدلتے رہے، حقہ جل جاتا تو نوکر دوسرا حقہ لا کر رکھ دیتا اور پہلا حقہ اُٹھا لے جاتا۔ یہ ناممکن تھا کہ جب ایک گلفشانی کر رہا ہو تو دوسرا حقہ چھوڑ کر جواب دے۔ یہاں تک کہ وقت ختم ہو جاتا اور یہ صاحبان ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو جاتے!

تماشائی

خاکے

نوجوان طالب علم

میں جب ۱۹۲۴ء میں کیمبرج پہنچا تو وہ وہاں پہلے ہی سے موجود تھا، اس کا دوسرا سال تھا اور میرا پہلا، کسی نے مجھے اس سے ملا دیا اور اس نے مجھے ایک دن اپنے کالج لنچ پر بلایا، لنچ میں کچھ تکلف نہ تھا، نہ لفاست، اسی سادگی تھی جو کیمبرج کی زندگی کی جان ہے، میزبان شراب میں بیئر کی ایک بوتل بھی تھی، قریب قریب پوری بوتل اسے خود ہی پینی پڑی، اس کے مہمان (تین بشمول راوی) یا تو بالکل پیتے ہی نہ تھے، یا محض برائے نام، لنچ کے بعد تجویز ہوئی کہ برج کھیلا جائے جو بالاتفاق منظور ہوئی، میزبان نے یہ کہہ کر کہ میری ان کی ہار جیت نہیں، سب سے اچھے کھلاڑی کو اپنا ساتھی بنا لیا، اس نے کئی بار اپنے ساتھی سے اس بات کی معذرت کی کہ وہ شراب زیادہ پی گیا ہے اور اچھی طرح نہیں کھیل رہا، یہ معذرت مجھے اور میرے ساتھی کو قطعی غیر ضروری معلوم ہوئی، کیونکہ ہماری دانست میں اس نے نہ کبھی غلط کول دی اور نہ کبھی غلط پتا چلا، سات بجے شام کو کھیل موقوف ہوا تو میزبان اور اس کے ساتھی نے ہم دونوں سے سترہ سترہ شلنگ جیتے تھے، ہم دونوں نے جیب سے روپے نکال کر ادا کرنا چاہے، لیکن اس نے یہ کہہ کر روک دیا کہ کل پھر کھیلیں گے، تم لوگوں کو انتقام کا موقع دینا چاہیے، آج تمہاری قسمت بڑی خراب تھی، یہ بات طے ہوئی کہ دوسرے دن عزیزی کے یہاں لنچ رہے اور لنچ کے بعد تاش کھیلا جائے، دوسرے [illegible] ایک ساتھ ہو گئے، اور قسمت پھر ہمارے خلاف رہی، دونوں دن ملا کر ہم دونوں نے تیس تیس شلنگ ہارے جو ہم نے فوراً ادا کر دیے۔

اس کے بعد برابر ملاقات ہوتی رہی، اس کا انداز مربیانہ تھا، لیکن وہ کوشش کرتا تھا کہ یہ بات ظاہر نہ ہونے پائے، والے وہی مضمون لے رکھا تھا جو میں نے لیا تھا، وہ مجھے مشورے دیتا کہ کن لیکچروں میں شریک ہوں، کن لیکچروں میں شریک ہونے کی ضرورت نہیں، کن سوسائٹیوں کا ممبر ہوں، لندن جاؤں تو کہاں قیام کروں، کس درزی سے کپڑے سلواؤں، کہاں جوتے بنواؤں، میں جوانا مرادت مند کی طرح ان "پیر دانا" کی باتیں سن لیا کرتا تھا۔ حالانکہ عمر میں وہ مجھ سے سال دو سال کم ہی ہو گا۔

کیمبرج میں مجھے رہتے ہوئے جب کچھ دن ہو گئے اور ملاقاتوں کا دائرہ وسیع تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ لوگ جو اپنے کو مردم شناس

ہو گیا تو اس کے والد کا میں نے ذکر کیا، اُس نے لکھا تھا: میں اب بھی جب اُسے یاد کرتا ہوں، تو مجھے شرم آتی ہے، کوسٹیلو کی خفگی بجا تھی، لیکن میرا غصہ بھی بے سبب نہ تھا۔ تم جانتے ہو کہ ساری دولت میرے والد کی پیدا کی ہوئی ہے، ان کا بچپن اور جوانی بڑی تنگ دستی میں کٹی ہے، انھوں نے میری تربیت خاص طور پر کی ہے، وہ بچپن ہی سے میرے کان میں یہ بات ڈالتے رہے ہیں کہ ان لوگوں کی قدر کروں جو بے غرض مجھ سے ملتے ہیں، اور غرض والوں کی دوستی پر بھروسا نہ کروں، اُن کی یہ نصیحت رہی ہے کہ خوشامد ہرگز بے وجہ نہیں ہوتی، اور ضرورت سے زیادہ خوش اخلاقی ڈسنے کی تیاری ہے۔"

"اس لیے تم دیو [illegible]" "جو ضرورت سے زیادہ خوش اخلاق ہے، وہ ایمان دار نہیں ہو سکتا" میں نے ایک فرانسیسی مقولہ اسے یاد دلایا۔

"یہ کس کا قول ہے، میرے والد کی بات جیسی ہے۔"

"مجھے مصنف کا نام یاد نہیں" لیکن کیا تمھارا یہاں آنے کے درکار بڑی خوش اخلاقی کی بات ہے؟

"واقعہ تو سنو، یہ تو اونٹ کی پیٹھ پر آخری تنکا تھا، ورما سے مجھ سے زیادہ ملاقات نہ تھی، سوا صاحب سلامت کے کبھی بات چیت نہیں ہوئی، ایک دن بڑے اصرار سے اس نے مجھے لنچ پر بلایا، مجھے انکار کی کوئی صورت نظر نہ آئی، میں نے قبول کر لیا، جس دن اُس نے مجھے بلایا تھا، صبح ہی سے بڑی برف باری ہو رہی تھی۔ جی میں آیا کہ کون گھر سے باہر نکلے، لیکن بادل ناخواستہ نکلنا ہی پڑا۔ میں نے اُس کے یہاں پہنچ کر گھنٹی بجائی، لینڈ لیڈی کے بجائے خود ورما نے دروازہ کھولا، میرا اوورکوٹ اُتار کر کھونٹی پر رکھا، اور کمرے میں لے جا کر سب سے آرام دہ کرسی پر آگ کے سامنے مجھے بٹھایا۔ میرا خیال تھا کہ اُس نے اور لوگوں کو بھی بلایا ہوگا۔ لیکن یہ خیال غلط نکلا، تھوڑی دیر کے بعد اس نے کھانا لانے کا حکم دیا، کھانا آیا، اتنا کھانا اور ایسا کھانا کیمبرج میں تو مجھے کبھی کسی نے نہیں کھلایا تھا، اس پر طرہ یہ کہ شیمپین کی بھی ایک بوتل تھی۔

میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "سو یو ہیڈ اول دی لک ان دی ورلڈ" (کچھ لوگ قسمت کے بڑے دھنی ہوتے ہیں)

"جی ہاں!" دن کا وقت اور شیمپین، میں نے بہت منع کیا کہ نہ کھولو، وہ نہ مانا اور مجھے بھی اُس کی خاطر سے تھوڑی سی پینی پڑی۔ لیکن تم یقین کرو کہ شیمپین اور لنچ کی اُس کی گفتگو کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہ تھی، تعجب نہیں کہ اُسے سن کر میرا وزن بڑھ گیا ہو، خیر یہاں تک بھی مضائقہ نہ تھا، لیکن جب گفتگو میں بار بار یہ جملہ آنے لگا کہ "یو آر دی اونلی فرینڈ آئی ہیو" ممکن ہے کہ یہ شیمپین کا اثر ہو، لیکن میں بھی تو آخر آدمی ہوں۔ اس کا برداشت کرنا میری طاقت سے باہر تھا، اور قہوے کی پیالی ابھی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ میں اس سے

رخصت ہو کر چلا آیا، اجازت اس نے بڑی مشکل سے دی تھی، لیکن میری طبیعت کا اندازہ یہ تھا کہ اگر وہ اجازت نہ بھی دیتا تو اُسے میں چھوڑ کر چلا آتا، مجھے چاہیے تھا کہ میں اسے اپنے یہاں بلاتا، لیکن بلاتا تو بڑی بات ہے اس کے سلام کا جواب بھی بڑی رکھائی سے دیا کرتا تھا، اس کے بعد اس کا اس قدر بے تکلف ہونا، میں اقرار کرتا ہوں کہ مجھے نہایت ناگوار معلوم ہوا، اور مجھ سے وہ حماقت سرزد ہوئی جس پر اب تک شرمندہ ہوں۔"

ورما کی حمایت کرتے ہوئے میں نے شرما کو جواب دیا۔ آخر تمہارا اعتراض کیا ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ ورما کی دوستیوں میں غرض کا پہلو شامل ہوتا ہے اور ان کی بنیاد اعتماد پر نہیں، تو یہ کوئی بڑی بات نہیں، آگے چل کر ہم سب یہی کرنے لگے۔ دنیا اگر سچ پوچھو تو قابل مبارک باد ہے کہ اسے اس کم سنی ہی میں یہ گر معلوم ہو گیا کہ دو چڑیوں کا شکار ایک ہی پتھر سے ہو سکتا ہے، دوستی کو اگر اپنے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنایا جائے تو اس میں مضائقہ کیا ہے؟ یہ انسان کی عام کمزوری ہے۔"

شرما کی نصیحت کے باوجود میں ورما سے ملتا رہا، اس نے وقتاً فوقتاً مجھ سے روپے بھی قرض لیے اور ہر بار وقت سے پہلے ادا کر دیا۔ زمانہ جوں جوں گزرتا گیا مجھے بھی اس کا احساس ہوتا گیا کہ گو ورما بددیانت نہیں، لیکن پرلے سرے کا کائیاں اور خود غرض ضرور ہے، ایک بار تعطیل میں قطعی فیصلہ ہو گیا تھا کہ وہ حلیم اور میرے ساتھ ایسٹ بورن چلے گا لیکن عین وقت پر اُس نے آکر کہا کہ "میں سوئٹزرلینڈ جا رہا ہوں۔" آئینگر سے میں نے لاکھ کہا کہ میں تم سے اور حلیم سے ایسٹ بورن جانے کا وعدہ کر چکا ہوں، لیکن اس نے ایک نہ سنی۔" تھوڑی دیر کے بعد اپنے جرم کے استحقاق میں یہ دلیل پیش کی۔ "تم جانتے ہو آئینگر صاحب جا رہا ہے اور مجھے بیرسٹری کرنی ہے۔ اس کی دوستی میرے لیے بڑی مفید ہو گی۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارا اور حلیم کا مجھ پر زیادہ حق ہے لیکن کیا کروں مجبور ہوں۔" یہ عذر گناہ بدتر از گناہ سہی، لیکن اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش نہ تھی۔ میں اُس کا ساتھ لندن میں بھی رہا ہے، بار جو میں اس کے ساتھ تھیٹر گیا تو میرا ٹکٹ بھی اسی نے خریدا، دوسری بار میں اپنے خرچ سے تھیٹر لے گیا۔ تیسری مرتبہ اُس نے ٹکٹ خریدنے کی آمادگی تو ظاہر کی، لیکن اُس کا ہاتھ جیب کی طرف اس آہستہ آہستہ جا رہا تھا کہ سینما کی سلو موشن پکچر کا لطف آ رہا تھا، جب تک وہ بٹوا نکالے میں نے ٹکٹ خرید لیا تھا، چوتھی بار غلطی سے وہ بٹوا گھر ہی پر بھول آیا تھا، پانچویں مرتبہ جو اس نے تھیٹر ساتھ چلنے کی تحریک کی تو میں نے کہہ دیا کہ میرے پاس کافی روپے نہیں، اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا کہ "تم بہت تکلف کرتے ہو۔ تمہارے پاس نہیں ہیں تو کیا ہوا، میرے پاس تو ہیں۔"

ورما کو کیمبرج سے ڈگری مل گئی، لیکن قانون کے امتحان باقی تھے، اُس نے کہا تھا کہ دو برس اور رہوں گا، لیکن اس نے

امتحان جلد ختم کر لیے اور ایک برس کے اندر ہی ہندوستان واپس چلا گیا۔ اس کو پانچ چھ مہینے گزرے تھے کہ ایک دن پٹی کیوری میں شرما سے ملاقات ہوئی، وہ ہیفرکی دکان سے باہر نکل رہا تھا، اور اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی، جو بعد میں معلوم ہوا کہ پیرانڈیلو کے ڈرامہ کا انگریزی ترجمہ ہے، شرما مجھے پٹی کیوری ہی کے کسی قہوہ خانے میں لے گیا، اور ملازمہ کو قہوہ لانے کا حکم دینے کے بعد یوں گویا ہوا۔۔

"تمہیں ورما کا آخری کارنامہ بھی معلوم ہے؟" میں نے جواب دیا کہ ہندوستان جاتے وقت وہ مجھ سے ملا بھی نہیں، شرما نے دریافت کیا کہ میرے روپے تو اس کے ذمے نہیں نکلتے تھے، یہ صاف بات تھی کہ شرما کو ورما کی ایمانداری میں شک تھا۔ اور میں نے اس کے شکوک کو دور کرنے کی کوشش کی۔

"یہ بات نہیں، ورما میں اور جو کچھ برائیاں ہوں، وہ معاملہ نہ تھا، مجھ سے اس نے بارہا قرض لیا، اور ہر بار وقت سے پہلے ادا کر دیا۔"

"تم نے کبھی انگریزوں کا یہ مقولہ بھی سنا ہے۔ 'اونسٹی از دی بسٹ پالیسی'۔ ایمانداری کسی اخلاقی اصول پر مبنی نہ تھی وہ محض ایک [illegible] تھا کہ بعد میں اچھی طرح لوٹنے کا موقع ملے، تمہیں یہ سن کر تعجب ہوگا کہ چلنے کے وقت کیمبرج کی مختلف دکانوں سے اس نے ڈیڑھ سو پونڈ سے زیادہ کی چیزیں خریدیں، اور ایک پیسہ ادا کئے بغیر ہندوستان روانہ ہو گیا، مجھے یقین ہے کہ اگر اسے موقع ملا ہوگا تو اس نے لندن کے بھی چار دکانداروں کو بھی چرکے دیے ہوں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی دکانداروں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ہندوستانیوں کے ہاتھ قرض کا بیوپار نہ کیا جائے۔ مجھے یہ بات پہلے پہل راٹیڈر امپیر کے یہاں معلوم ہوئی، میں نے وہاں سترہ مولا تلنگ کی ٹائیاں اور موزے خریدے تھے اور تین قمیصوں کا آرڈر دیا تھا، میں نے میرا آرڈر تو لکھ لیا لیکن نہایت ادب سے کہنے لگا کہ قیمت آپ اسی وقت ادا کریں گے یا جس وقت چیزیں آپ کے یہاں پہنچ جائیں گی؟" میں نے کہا کہ "میں کوئی نیا سردار تو ہوں نہیں، آج تمہیں یہ کیا گیا ہے؟" میری آواز بلند ہو گئی تھی، منیجر قریب ہی تھا، وہ اور قریب آ گیا، اور اس نے مجھ سے کہا کہ "مسٹر شرما ذرا تکلیف کر کے آپ میرے آفس میں چلیے۔" میں منیجر سے اچھی طرح واقف تھا اس کے ساتھ آفس میں گیا تو اس نے ورما کا واقعہ بیان کیا۔" ورما تین برس مسلسل اس دکان سے چیزیں خریدتا رہا، اور کبھی اس نے بل کے ادا کرنے میں ایک دن کی بھی دیر نہ کی۔ کیمبرج سے ڈگری لینے کے بعد اس نے ان لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ ابھی قانون کے امتحانات میں شریک ہونا ہے، کیمبرج میں ابھی دو سال قیام اور رہے گا، باوجود اس کے کہ اب یونیورسٹی کا ممبر نہ تھا، اس کا اعتبار اتنا تھا کہ یہ لوگ برابر اسے ادھار دیتے رہے، جانے سے قبل ورما نے تیس پونڈ کی چیزیں کچھ بنوائیں اور کچھ بنی بنائی مول لیں۔ بل جب اس کے مکان پر بھیجا گیا

تو لینڈ لیڈی سے معلوم ہوا کہ وہ تو ہندوستان چلے گئے ہیں۔ ورما کے بتائے ہوئے پتے سے اس وقت تک تین چار خط بھیجے جا چکے ہیں لیکن وہ خط اس وقت تک واپس آ چکے ہیں، ڈاک خانے والوں کو مکتوب الیہ کا پتا نہیں ملتا۔ میں نے خود رجسٹر منگوا کر دیکھا، ورما نے رہتک کا پتا دیا تھا، حالانکہ رہتک سے اس کو کوئی تعلق نہیں، اس نے منیجر سے کہا کہ تم حق بجانب ہو، اب آج سے میں تو عہد کرتا ہوں کہ دوسرے سے کبھی کسی دکان سے کوئی چیز ادھار نہ منگواؤں گا۔ منیجر نے مجھ سے بہت معذرت کی اور کہا میرا حکم آپ کے لئے نہیں، آپ دکان سے حسب دستور چیزیں منگوا سکتے ہیں، لیکن پہلے اس رعایت سے فائدہ اٹھانا منظور نہ۔ اس کے بعد تحقیق سے معلوم ہوا کہ ہارڈوک بلینڈ نیچے، سیرا ایڈمس، تھرسل، ڈکسن، سیفر، اسٹرل، سب کے ساتھ ورما نے یہی کیا ہے، ان کے علاوہ اور دکان داروں کو بھی اس نے لوٹا ہے، کہاں تک سب کا نام لوں، میری تحقیقات ابھی مکمل نہیں ہفر کا تو ابھی پتا چلا ہے۔ اب آپ فرمائیں کہ ... مالی ایمان داری کے متعلق آپ کی کیا شکایت ہے؟

میں نے ایک لمبا چوڑا خط ورما کو لکھا، ورما نے فوراً جواب دیا جو ... کرتے گئے

"تمہاری شکایت بجا ہے، ہندوستان، حسب معمول ... ہندوستان پہنچ گیا، یہاں کر کیں کی عسرت ... میرا ہوں) کی فضا اور یہی جسمانی اور ذہنی دونوں حیثیت سے یہاں آکر انسان ... ہمت ٹوٹ جاتی ہے اور دہ پست ہو جاتے ہیں، تم میرے والد صاحب سے نہیں ملے، بڑے جوہر کے آدمی ہیں، لیکن ذرا سی کسر یہ ہے کہ قوت متخیلہ بالکل محروم ہیں، انہوں نے میری تعلیم میں پچیس تیس ہزار روپے صرف کئے، واپسی پر قانون کی کتابیں منگوائیں، اور ہائی کورٹ میں اندراج کرا دیا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ محض میری وجہ سے لاہور میں قیام اختیار کیا، اس کے بعد انہوں نے سمجھ لیا کہ ذمہ داری ختم ہو گئی، اور میں چھ مہینے کے اندر شادی لال ... یا فضل حسین نہ بن جاؤں تو یہ میرا قصور ہے۔ تفصیل کہاں تک لکھوں، مختصر یہ ہے کہ اگر والدہ صاحبہ کی مہربانی نہ ہوتی تو ورما کو عبداللہ کے بدلے قینچی سگریٹ پینے پڑتے اور کلب کا خرچ تو قطعاً ناممکن ہوتا، شش جیسے میری داستان ... پھر بھی شکایت کرو گے کہ میں نے خط نہیں لکھا؟

اب ایسی اور شکایتوں کا جواب سنو۔ دکانداروں کو دھوکا دینے کی میری نیت نہ تھی، جس وقت میں یہاں کا آرڈر دیا بینک میں میرے ڈیڑھ سو پونڈ سے زیادہ موجود تھے، ایک تو والد صاحب ہی نے سفر کے اخراجات کے لئے کافی بھیجے تھے، دوسرے یہ کہ میں نے والدہ صاحبہ کو لکھ کر اور روپے منگوائے تھے، کیمبرج سے روانہ ہونے سے ایک دن میں نے لائیڈز بینک سے کل روپے نکال لئے اور اپنا کھاتا بند کرا دیا، ارادہ تھا کہ دکانداروں کے روپے اسی وقت ادا کر

لیکن گھڑی دیکھی تو یہ معلوم ہوا کہ لنچ کا وقت آ گیا ہے۔ میں نے اس کو تیسرے پہر کے لئے اٹھا رکھا اور بس پر سوار ہو کر جوئی ہٹن روڈ پہنچا۔ گھر آ کر جو دیکھتا ہوں تو جیب میں بٹوا ندارد۔ کسی نے جیب سے نکال لیا یا خود بخود گر پڑا۔ لنچ کھانے کا کسے ہوش تھا، ڈرا گھر دیکھا اور بس سٹینڈ تک تلاش کرتا ہوا گیا لیکن یہ معلوم کہاں گرا تھا، کچھ پتہ نہ چلا۔ اس کے بعد میں نے فوراً لوٹ کر پولیس آفس کو اطلاع دی اور پولیس کو ہدایت کر دی کہ کیمبرج اور لندن دونوں جگہ کا پتہ دے دیا کہ اگر پتہ چلے تو مجھے فوراً اطلاع دی جائے، دوسرے دن سخت پریشانی کے عالم میں لندن [illegible] اس خیال سے کہ کیمبرج میں کسی سے قرض لوں یا لندن میں کسی کو تکلیف دوں، میں نے گھر تار دے کر تیس پونڈ اور منگوائے ٹکٹ میں نے پہلے ہی خرید رکھا تھا، لندن میں دو چار روز اور ٹھہر سکتا تھا لیکن طبیعت بالکل اچاٹ تھی جلد از جلد وہاں سے روانہ ہو گیا۔ پیرس میں تین روز رہا سیدھا اسٹیلیو پہنچا، جہاز پر سوار ہو گیا، دکانداروں کو روپے ادا کرنا جانا باعث تھا، ڈیڑھ سو پونڈ محض تار دے دینے سے ہوا ہو جاتے، خیال آیا کہ چیزیں واپس کر دوں، لیکن کل سامان میں نے پہلے ہی لندن روانہ کر دیا تھا، اور وہ چیزیں جو خاص میری فرمائش سے [illegible] دکانداروں کے لئے بیکار ہو گئیں، تم میری جگہ پر ہوتے تو کیا کرتے؟ یہ اعتراض کہ میں نے اصلی پتا نہیں بتایا بہت مضحکہ خیز ہے، میرے والد صاحب جس زمانے میں، میں نے اپنا پتا دیا ہے، رہتک ہی میں تھے، اب پنشن لے کر لاہور میں مقیم ہو گئے ہیں، رہتک کا خط اگر لاہور نہ پہنچے تو میرا کیا قصور؟ تم میرا نیا پتا سب کو دے دو، اور جس جس کو یہاں جانا ہو میری طرف سے اطمینان دلا دو کہ جہاں تک جلد ممکن ہو گا میں روپے ادا کر دوں گا۔ آینگر اسی ضلع میں ہیں، ان کے اجلاس میں، میں کئی بار کام کر چکا ہوں، لیکن اب وہ پہچانتے نہیں تفصیل کسی دوسرے وقت، تمہارے واپسی کے دن بھی اب قریب ہوں گے تمہیں اگر زیادہ تکلیف نہ ہو تو دو تصویریں لیتے آنا، قیمت میں یہاں آؤ گے تو ادا کر دوں گا، ایک تو وہ تصویر ہے جو میں نے ان کے ساتھ کھنچوائی تھی دوسرا اس ڈنر کا گروپ ہے جو میں نے اس کیمبرج سے رخصت ہونے کے وقت آینگر کو دیا تھا، میں یہ دونوں تصویریں ساتھ لایا تھا، لیکن راستے میں وہ بکس ہی غائب ہو گیا جس میں یہ تصویریں تھیں" میں نے یہ خط شرما کو سنایا، وہ دیر تک ہنستا رہا، جب اسے ہنسی سے افاقہ ہوا تو میں نے اس سے پوچھا "تمہارا پیارا ملو اس معاملے میں کیا کہتا ہے؟ ورما ایماندار ہے یا بے ایمان؟" "یہ تو مجھے علم نہیں کہ پیارا ملو کیا کہے گا، لیکن یہ میں ضرور جانتا ہوں کہ ورما تمہیں کیا سمجھتا ہے، اور میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔" لوگ کہتے ہیں کہ علم شے بہ از جہل شے، لیکن میں نے یہ معلوم کرنے کی بالکل کوشش نہ کی کہ ورما مجھے کیا سمجھتا ہے۔

[illegible] بی بی نے چھوٹتے ہی کہا کہ " میں نے اپنی لفظوں میں کوشش کی ہے " لیکن بڈھے کے جوش و خروش نے اسے ٹھنڈا کر دیا " نہیں میں اس کا قائل نہیں " اس نے سوچ کر جواب دیا اور پھر ذرا ٹھہر کر وہ کہنے لگا " میں نہیں مانتا کہ روح موت کے بعد زندہ رہتی ہے۔ مجھے اس کا [illegible] ہے لیکن کیا چارہ ہے، مجھے بڑا صدمہ ہے کہ اس قدر مشقت سے جمع کی ہوئی علمی دولت میرے مرجانے کے بعد خاک میں مل جائے گی۔ میں نے نہ تو کوئی کتاب لکھی ہے، کبھی ان کے متعلق کوئی لیکچر دیا ہے میری عمر ملازمت میں گزری ہے (وہ فرانسیسی کونسلر سروس میں تھا) اور مجھے شاذ و نادر ہی ایسے [illegible] ملے جو میرے علم سے مستفید ہو سکتے۔ مجھے ایسے مواقع بھی کم ملے کہ میں اپنا علم دوسروں کے سامنے ظاہر کرتا، اس علمی سرمایے کا ایک لفظ بھی میرے بعد نہ بچے گا اگرچہ مجھے اس کا صدمہ ضرور ہے۔ مگر قدرت کے مقابلے میں سوائے سر جھکانے کے چارہ ہی کیا [illegible] اس پر بھی میں کتب بینی سے باز نہیں آتا [illegible] پڑھتا اس لیے ہوں کہ میں علم کا پیاسا ہوں، اور اس ضعیفی میں [illegible] لیے یہی ایک واحد ذریعہ تفریح ہے یا دوسرے میری موت کے دن قریب آتے جا رہے ہیں، میں پڑھتا ہوں [illegible] یہ معلوم کر کے کہ میری زندگی اب تھوڑی سی ہے میں اور زیادہ کتب بینی کرتا ہوں، انتہائی عجلت کے ساتھ، مجھے ان باتوں سے [illegible] حاصل کرنی ہے جن سے میں اب تک نابلد ہوں، سونے کے وقت تک پڑھتا رہتا ہوں [illegible] کو اٹھنے کے ساتھ ہی [illegible] پھر پڑھا کرتا ہوں، کبھی کبھی میں اپنے آپ سے [illegible] کرتا ہوں کہ " اب جب کہ میں [illegible] سال سے زیادہ جی نہیں سکتا تو کیا کتابوں کے مطالعے سے کوئی [illegible] ہو سکتا ہے؟"

ایک برس کے بعد جب میں اس سے پھر ملا تو وہ اتنا بیمار تھا کہ بیٹھے بیٹھے بات چیت نہیں کر سکتا تھا اور اس نے اس سے اجازت چاہی کہ لیٹے ہی لیٹے گفتگو کرے [illegible] دوران گفتگو میں وہ کبھی کبھی یکایک قلب پر ہاتھ رکھ دیتا تھا اور بے تاب ہو جایا کرتا تھا [illegible] کا سلسلہ شروع کرتا " (کومیڈی آف ہیومرس) ذرا عامیانہ تو ضرور لیکن یہ خیال کہ [illegible] ہو جاتی ہے، بلاشبہ صحیح تھا اور جیخوف کے سوا [illegible] پسند [illegible] کہ محض کسی [illegible] کے ذریعہ [illegible] بھی ظاہر کی جا سکتی ہیں۔"

" اب تم [illegible] میں [illegible] ایک [illegible] کیا ہو سناؤں گی، مجھے یقین ہے کہ مسٹر " [illegible] وہ بولتا ہی رہا " [illegible] لیکن میں فرانسس ڈمسن کے ہونڈ آف ہیون [illegible] کا تسکا [illegible] اور [illegible] سیسرلی پیرا کو میں (پریوں کی ملکہ) اس نے اپنے قلب پر [illegible] رکھا اور [illegible] اشارہ کرتے ہوئے بولا " میرا [illegible] مکمل ہے یہ خیال [illegible] بڑی اذیت پہنچاتی ہے کہ میں [illegible] سے چھوڑ جاؤں گا۔ ابھی ایسی کتابیں بھی ہیں جو میں نے اب [illegible] نہیں پڑھیں، یہی وجہ ہے کہ میں رات دن پڑھتا رہتا ہوں، مجھے وقت کا مقابلہ کرنا ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک [illegible] حرص ہے، لیکن یہ خیال کہ میں ایسی کتابیں چھوڑ جاؤں جو میری نظر سے نہیں گزری ہیں میرے لئے ناقابل برداشت ہے، [illegible] میری نظر میں انسانوں کی طرح ہیں " اس نے اپنے مصنوعی دانتوں کو جو کسی سرکش چڑیا کی طرح جسے کسی نے پنجرے میں بند کر رکھا ہو، ہر وقت باہر نکلے آتے تھے، بڑی کوشش سے درست کیا۔ اور پھر گویا ہوا " اگر ہماری روح [illegible] کے بعد باقی رہتی ہے تو میں چاہتا ہوں کہ ہر شخص کو اپنا بہشت اپنے دل کی خواہش کے مطابق بنانے کا موقع

دیا جائے۔ اگر ایسا ہے تو میرے بہشت میں بڑے بڑے ہوادار کمرے ہوں گے، جہاں بے شمار کتابیں ہوں گی، ان گنت کتب خانے، جہاں میں ہمیشہ کتابیں پڑھتا رہوں اور تنگیٔ وقت کی کبھی شکایت نہ ہو۔"

"لیکن کس قسم کی کتابیں؟ یہی کتابیں؟" میں نے سوال کیا

"ہاں، بہت سی کتابیں ابھی ایسی ہیں جنھیں میں مرنے سے قبل ختم نہیں کر سکتا، وقت قریب آتا جاتا ہے۔"

میں رخصت ہو رہا تھا کہ اس نے میز پر جو پارسل رکھا تھا، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"فارسی شاعری"

"اچھی کتابیں ہیں؟"

"ابھی تک پارسل کھولا نہیں، پھر ملاقات ہوگی تو بتاؤں گا۔"

اس کے بعد جو میں گیا رات کا وقت تھا مینہ پڑ رہا تھا (میرے چند دوستوں نے جو کھانے پر مقیم تھے) مجھے مدعو کیا تھا، دعوت کی تاریخ مجھے غلط یاد تھی اور دو آخری گاڑی جو گاؤں جاتی تھی چھوٹ گئی تھی) ملازمہ نے کہا کہ میاں شہر کو گئے ہیں اور غالباً آدھی رات سے پہلے واپس نہیں آئیں گے۔ میں کتب خانے میں ان کے انتظار میں ایک کتاب نکال کر پڑھنے لگا۔ کوئی دو گھنٹے کے بعد مجھے قدموں کی آہٹ نے چونکا دیا، یہ آنے والا وہی بڈھا تھا جو وہی لباس پہنے تھا جس میں پہلی بار میں نے اسے دیکھا تھا۔ چاند کی روشنی میں جو برآمدے کے شیشوں سے گزر کر اندر آرہی تھی، یہ ضعیف شخص مورت کی طرح سفید معلوم ہو رہا تھا۔ شاید وہ اپنی خواب گاہ سے کتب خانے میں کوئی کتاب لینے آیا تھا۔ میں کھڑا ہو گیا، وہ بھی ٹھہر کر مجھے دیکھنے لگا۔ بعد ازاں الماری کی طرف جا کر اس نے دو بڑی بڑی جلدیں نکال لیں۔ اور پھر دروازہ سے باہر چلا گیا۔ میں نے سمجھا کہ یا تو اس نے مجھے دیکھا ہی نہیں، یا وہ خواب کی حالت میں یہاں چلا آیا تھا یا بیماری نے اس کی بینائی کو کم کر دیا تھا۔

صبح کے وقت جب اس کی بی بی اپنی لڑکی کے ساتھ ٹاؤن سے واپس آئی تو میں نے اس سے کہا "آپ کے شوہر شب کو کتابیں لینے کے لئے نیچے اترے تھے، لیکن وہ مجھے پہچان نہ سکے" یہ سن کر وہ مجھے تعجب کے ساتھ گھورنے لگی، "وہ تو تین ہفتے ہوئے جمعے کے دن انتقال کر گئے۔"

"میں نے تو رات انہیں دیکھا تھا، وہ دو کتابیں کتب خانے سے نکال کر ساتھ لے بھی گئے۔"

ہم لوگ فوراً اس بات کی تحقیقات کے لیے کتب خانے میں گئے۔ اس کی بی بی نے ان جلدوں کی خالی جگہ کو فوراً دیکھ لیا اور فہرست دیکھ کر ان دونوں کتابوں کے نام بھی معلوم کر لیے، یہ لارڈ بائرن کے خطوط تھے، پہلی اور دوسری جلد۔

شبِ وصال جھلکتا ہوا وہ پیراہن
جو چاہے کی تمنا کرے وہ سو سو جائے

وہ اس میں ڈوبی ہوئی اور ادھ کھلی آنکھیں
نگاہ ان سے ملائے کوئی تو دل کھو جائے

یہ تیرگی، یہ اندھیرا، یہ ظلمتوں کے پڑاؤ
یہ اپنا دل ہی کوئی اور ہو تو جل کے رو جائے

نہ جانے کون سا جادو ہے تیری آنکھوں میں
اٹھے یہ جب بھی تغافل کو داغ دھو دھو جائے

(اختر)

(۱)

[illegible] شفیق من مولوی سید اشرف علی صاحب ایم۔ اے

بوقت مراجعت پٹنہ سے آپ ضرور مجھ سے ملتے جائیے گا۔ ایک امر آپ سے کہنا ہے اور بغیر زبانی کہے طے نہیں ہو سکنے کا۔ مولوی [illegible] صاحب [illegible] شادی کی مبارکباد دیتا ہوں۔ معلوم نہیں کہ آپ کو بھی بدون یا نہیں۔ یہاں سب دوست منتظر ہیں کہ مولوی امجد علی صاحب [illegible] دعوت شادی کی تقریب میں کریں گے۔ مولوی محمد حسن صاحب کی خدمت میں سلام سونپ۔ مولوی امجد علی صاحب کی خدمت [illegible] کا ارادہ علی گڑھ میں آکر دعوت کرنے کا ہو، سلام

والسلام خاکسار

سید احمد

علی گڑھ ۶ جولائی

(۲)

جناب مولانا مولوی سید امجد علی صاحب ایم۔ اے

آپ کا عنایت نامہ اگرچہ دل خراش تھا جو کچھ مصائب و تردد ت دریافت فرمادیں بجا ہے۔ بہرحال "از تن برضائے چارہ نیست"۔ قبل آنے عنایت نامہ آپ کے تاریخ (کرم خوردہ) مقرر ہو چکی ہے (کرم خوردہ) ۲۱ جولائی، [illegible] معلوم نہیں آپ کے مناسب ہے یا نہیں۔ بہرحال یہ تاریخ مقرر ہو گئی ہے۔ کاغذات معمولی چھپ گئے ہیں۔ دو تین روز میں روانہ ہوں گے۔

والسلام

خاکسار سید احمد

علی گڑھ ۸ جولائی ۱۸۹۵ء

محمد موسیٰ کا حال معلوم ہیں کس طرح ہے۔ اور آپ کے پاس ہیں یا نہیں۔

(۳)

مخدومی مکرمی مولوی سید محمد امجد علی صاحب۔

۲۱ جولائی کو (کرم خوردہ) کا اجلاس ہوگا۔ امید کہ آپ اس میں شریک ہوں گے۔ مگر اب تک آپ نے اطلاع نہیں دی کہ کس اور کس تاریخ آپ تشریف فرما ہوں گے۔ اگرچہ وقت اجلاس گیارہ بجے لکھا گیا ہے مگر ہم ساڑھے بارہ بجے تک انتظار کریں گے تا جو لوگ آنے والے ہیں وہ بھی آجاویں۔

والسلام

خاکسار سید احمد

۱۷ جولائی ۱۸۹۵ء

(۴)

مخدومی و مکرمی مولوی سید امجد علی ایم اے

میری چٹھی بھیجنے کے بعد مسٹر تھیوبالڈ پرنسپل کالج نے کہا کہ [illegible] جو اُردو میں چھپی ہوئی ہے اس کو کس نے سنا اور مطالعہ کیا یا یونہی ڈال دی۔ اگر آپ ازراہ مہربانی سورۃ پر اپنی بحث کے اسی مہینہ میں لکھدیں گے تو میں آپ کا نہایت ممنون ہوں گا۔

والسلام

خاکسار سید احمد

علی گڑھ ۴ اکتوبر ۱۸۹۶ء

(۵)

میرے مکرم و معظم عنایت فرما

میں نہایت خوشی سے آپ کو شمس العلماء کا خطاب پانے کی مبارکباد دیتا ہوں اگرچہ اس دو سطری مبارکباد سے کم آپ کے دوستوں کو ضرور ہے کہ عام جلسہ خوشی کا کریں۔ ڈنر ہو۔ اسپیچیں ہوں۔ لیکن افسوس کہ میں وہاں موجود نہیں ہوں۔ لہٰذا مبارکباد پر اکتفا کرتا ہوں۔ بڑے دن میں برابر بیمار رہا اور سخت۔ اس سبب سے [illegible] سکا۔

خادم و معتقد

[illegible]

[illegible] ۱۸۹۷ء

(۶)

مولانا!

آپ کے فضل و کمال کا مجھ سے زیادہ کون معترف ہوگا باوجود اس کے میں نے انجمن اردو میں آپ کو تکلیف نہیں دی، جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں نے اس طرف آپ کے میلان کا کوئی ذکر نہیں سنا تھا۔ آج ایک صاحب کے خط سے کچھ امید بندھی تو یہ عریضہ لکھتا ہوں۔ روداد انجمن اردو اور رسالہ خدمت ہے۔ سب سے بڑا کام لغات علمیہ کا ترجمہ ہے۔ ناگری پرچارسبھا نے سات جلدوں میں سائنٹفک لغت تیار کر لیا۔ لیکن ہمارے یہاں کون کرے گا۔ انگریزی دان عربی سے کورے ہیں و بالعکس۔ مصطلحات کیمسٹری الگ چھپوا لیے ہیں، وہ بھیجتا ہوں۔ کیا آپ اس کا کوئی حصہ ترجمہ فرما دیں گے؟ ایک بڑی ضرورت یہ ہے کہ ارسطو کی منطق کا جو انگریزی میں ترجمہ ہو گیا ہے، ترجمہ کیا جائے تاکہ موازنہ ہو سکے کہ مسلمانوں نے اس پر کیا اضافہ کیا۔ دوسرا کام میں کر دوں گا۔ لیکن کیا آپ پہلا کام کر دیں گے۔ غرض آپ اس مد میں جو کچھ کر سکیں اس سے مطلع فرمائیے۔

شبلی۔ حیدرآباد ۴ مئی ۱۹۰۴ء

(۷)

نادر منزل سیف آباد
حیدرآباد دکن۔ ۲۲ نومبر ۳۷ء

مشفقی و مکرمی۔ تسلیم

آپ کا عنایت نامہ پہنچا جسے پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ جس ہمت اور مستعدی سے اردو کی خدمت کر رہے ہیں وہ بہت قابل داد ہے۔ آپ اور مولانا ابوالکلام کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ پر لطف ہے۔ میں آپ سے بالکل متفق ہوں۔ اگر گورنمنٹ ہماری تجویز منظور نہ کرے تو بلاشبہ ہمیں اپنا حق حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کی کوشش کرنی چاہیئے۔

مولانا ابوالکلام کا خط میرے پاس محفوظ ہے اس میں انھوں نے کہیں یہ نہیں لکھا کہ کمیٹی کی ضرورت نہیں۔ میں اس خط کی نقل آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ میں آپ کو پہلے خط میں لکھ چکا ہوں کہ تمام تجویزیں پیش نظر ہیں۔ اس وقت میں سرمایہ کی فکر میں ہوں۔ یہاں جو امداد کی درخواست دی تھی وہ معاملہ رو براہ ہو رہا ہے۔ ذرا مجھے اس سے فارغ ہو لینے دیجئے تو میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ یہ نہ ہوا تو سب ہیچ ہے۔

انجمن دہلی پہنچتے ہی ماہانہ رسالہ شائع کرے گی جس کا نام ہوگا "ہماری زبان"۔ اس میں افکار و واقعات جیسی سب چیزیں آجائیں گی۔ یہ رسالہ پروپیگنڈا کا کام بھی دے گا اور معلومات کا بھی، زبان آسان ہوگی جسے سب سمجھ سکیں۔ اڈیٹر وغیرہ سب میں نے تجویز کر لیا ہے۔

عبدالحق

(۸)

۱۰ مئی ۳۸ء

شفیقی و مکرمی۔ تسلیم

عنایت نامہ پہنچا۔ بہت ممنون ہوں۔ آرزو جلیلی صاحب کی رپورٹ ابھی تک مجھے نہیں ملی، حیدرآباد کی ڈاک بھی یہیں آجاتی ہے شاید کل پرسوں تک آجائے۔ اپنی رپورٹ آپ میرے نام یہیں بھیج دیں۔

کتب خانہ کے حالات معلوم ہوئے۔ بہت افسوس ہوا۔ ہماری قوم کے لوگ بھی عجیب و غریب ہیں۔ نہ خود کام کریں اور نہ دوسرے کو کرنے دیں۔ آپ کو ایسے لوگوں کے اعتراضات کی مطلق پروا نہیں کرنا چاہیے، مگر آپ کو بد دل بھی نہیں ہونا چاہیے۔ کیا آپ کے الگ ہو جانے سے معاملات درست ہو جائیں گے؟ میرے خیال میں تو اور بدتر ہو جائیں گے۔

مہربانی کر کے تذکرۂ میر حسن کی تکمیل (جس طرح بھی ممکن ہو) فرما دیجئے، بڑی عنایت ہوگی۔

دیوان جوشش کے متعلق ذرا نظامی صاحب کو لکھئے کہ یہ کیا بات ہے۔ چھوٹی سی کتاب ہے چند روز میں طبع ہو سکتی ہے۔

میں کوشش کروں گا کہ یہاں سے واپسی میں پٹنہ ٹھہرتا ہوا جاؤں اور آپ کو پہلے سے اطلاع کر دوں گا۔

عبدالحق

مجبوری اس لئے ہے کہ تم نے اپنے تئیں ابھی تک اس کے لئے تیار نہیں کیا تھا اور بربادی ہی کو نجات کا ذریعہ سمجھ رکھا تھا۔ میری مراد غیر ملکی غلامی سے ہے جس کے ہاتھوں تم نے مدتوں حاکمانہ طمع کا کھلونا بن کر زندگی بسر کی ہے۔ ایک دن تھا جب تم کسی جنگ کے آغاز کی فکر میں تھے اور آج اس جنگ کے انجام سے مضطرب ہو۔ آخر تمہاری اس عجلت پر کیا کہوں کہ ادھر ابھی سفر کی جستجو ختم نہیں ہوئی اور ادھر گمراہی کا خطرہ بھی درپیش آگیا ہے۔

میں نے تمہیں ہمیشہ کہا اور پھر کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو۔ شک سے ہاتھ اٹھا لو اور بدعملی کو ترک کر دو۔ یہ تین دھار کا انوکھا خنجر لوہے کی اس دو دھاری تلوار سے زیادہ کاری ہے جس کے گھاؤ کی کہانیاں میں نے تمہارے نوجوانوں کی زبانی سنی ہیں۔

یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے اس پر غور کرو۔ تمہیں محسوس ہوگا کہ یہ غلط ہے۔ اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ اپنے دماغوں کو سوچنے کی عادت ڈالو اور پھر دیکھو کہ تمہارے یہ فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں۔ آخر کہاں جا رہے ہو۔ کیوں جا رہے ہو؟ یہ دیکھو مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا؟ ابھی کل کی بات ہے یہیں جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور تم ہو کہ یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے، حالانکہ دہلی تمہارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔

عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو۔ جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے تمہارا جوش و خروش بے جا تھا۔ اسی طرح آج تمہارا یہ خوف و ہراس بھی بے جا ہے۔ مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ سچے مسلمان کو تو کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔ چند انسانی چہروں کے غائب ہو جانے سے ڈرو نہیں۔ انھوں نے تمہیں جانے ہی کے لئے اکٹھا کیا تھا۔ آج انھوں نے تمہارے ہاتھ میں سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تو یہ تعجب کی بات نہیں۔ یہ دیکھو کہ تمہارے دل تو ان کے ساتھ ہی رخصت نہیں ہو گئے۔ اگر دل ابھی تک تمہارے پاس ہیں تو ان کو اپنے اس خدا کی جلوہ گاہ بناؤ جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک امی کی معرفت فرمایا۔ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا ہُمْ یَحْزَنُوْنَ (جو خدا پر ایمان لائے اور اس پر جم گئے تو ان کے لئے نہ تو کسی ڈر ہے اور نہ کوئی غم)۔ ہوائیں آتی ہیں اور گذر جاتی ہیں یہ صرصر سہی لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں۔ ابھی دیکھتے آنکھوں ابتلا کا یہ موسم گذرنے والا ہے۔ یوں بدل جاؤ جیسے پہلے کبھی اس حالت میں نہ تھے۔

میں کلام میں تکرار کا عادی نہیں لیکن مجھے تمہاری تغافل کیشی کے پیش نظر بار بار کہنا پڑتا ہے کہ تیسری طاقت اپنے گھمنڈ کا پشتارہ اٹھا کر رخصت ہو چکی ہے جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا ہے۔ سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچہ توڑ چکی ہے اور اب نیا سانچہ ڈھل رہا ہے۔ اگر اب بھی تمہارے دلوں کا معاملہ بدلا نہیں اور دماغوں کی چبھن ختم نہیں ہوئی تو پھر حالت دوسری ہے لیکن اگر واقعی تمہارے اندر سچی تبدیلی کی خواہش پیدا ہو گئی ہے تو پھر اسی طرح بدلو جس طرح تاریخ نے اپنے تئیں بدل لیا ہے۔

آج ہم ایک دور انقلاب کو پورا کر چکے ہیں۔ ہمارے ملک کی تاریخ میں کچھ صفحے خالی ہیں اور ہم اُن ہی صفحوں میں زیب عنوان بن سکتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ ہم اس کے لئے تیار بھی ہوں۔

عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو۔ یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لئے تیار نہ تھے بلکہ اب تیار ہو جاؤ۔ ستارے ٹوٹ گئے لیکن سورج تو چمک رہا ہے اس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو۔ جہاں اُجالے کی سخت ضرورت ہے۔

میں تمہیں یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرو۔ کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمہارا شعار رہا ہے۔ میں کہتا ہوں جو اُجلے نقش و نگار تمہیں اس ہندوستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آ رہے ہیں وہ تمہارا ہی قافلہ لایا تھا انھیں بھلاؤ نہیں۔ انھیں چھوڑو نہیں اُن کے وارث بن کر رہو اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لئے تیار نہیں تو پھر تمہیں کوئی طاقت بھگا نہیں سکتی۔ آج زلزلوں سے ڈرتے ہو کبھی تم خود ایک زلزلہ تھے۔ آج اندھیرے سے کانپتے ہو۔ کیا یاد نہیں رہا کہ تمہارا وجود ایک اجالا تھا۔ یہ بادلوں کے پانی کی سیل کیا ہے کہ تم نے بھیگ جانے کے ڈر سے اپنے پائنچے چڑھا لئے ہیں وہ تمہارے ہی اسلاف تھے جو سمندروں میں اتر گئے۔ پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا۔ بجلیاں کڑکیں تو اُن پر مسکرا دئے۔ بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا۔ صرصر اٹھی تو رخ پھیر دیا۔ آندھیاں آئیں تو ان سے کہہ دیا کہ تمہارا راستہ یہ نہیں ہے۔ یہ ایمان کی جانکنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے ہی گریبان کے تار بیچ رہے ہیں اور خدا سے اس درجہ غافل ہو گئے ہیں جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہ تھا۔

عزیزو! میرے پاس تمہارے لئے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے چودہ سو برس کا پرانا نسخہ ہے، وہ نسخہ جس کو کائنات انسانی کا سب سے بڑا محسن لایا تھا۔ قرآن کا یہ اعلان۔ لا تہنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین۔

پنڈت جواہر لال نہرو

خطبۂ تقسیم اسناد ۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

علی گڑھ اور اس یونیورسٹی میں میری آمد ایک طویل وقفے کے بعد ہوئی ہے۔ نہ صرف وقت کے فاصلے نے بلکہ نظریہ اور نصب العین کے تعدد نے بھی ہم لوگوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ آپ یا ہم میں سے بہت سے حضرات آج کس طور پر سوچ رہے ہیں؟ کیونکہ پچھلے دنوں ہم جس دماغی بحران اور دل شکستگیوں کا شکار رہ چکے ہیں انھوں نے ہمارے درمیان شکوک اور شبہات کی راہیں کھول دی ہیں۔ آج واقعات کی رفتار غیر یقینی ہے لیکن مستقبل کی راہ تو اس بھی زیادہ تاریک اور دشوار گذار ہے۔ تاہم ہمیں حال کا مقابلہ کرنا ہے اور مستقبل کو اپنے موافق ڈھالنا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو دیکھنا ہے کہ ہم کہاں ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟ مستقبل پر اعتماد کامل کے بغیر ہمیں حالات اور وقت کی ٹھوکریں کھانی پڑینگی، ورنہ زندگی کے پیش نظر کوئی ایسا مقصد باقی نہیں رہ جائیگا جس کے حصول کی خاطر جد و جہد کی جائے۔

مجھے آپ کے وائس چانسلر کا دعوت نامہ منظور کرنے میں خوشی ہوئی کیونکہ میں آپ سب سے مل کر یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آپ کے دماغ میں کیا باتیں ہیں اور آپ کو یہ بتلانا چاہتا تھا کہ خود میرے اپنے دماغ میں کیا کیا ہے۔ ہمارے لئے ایک دوسرے کو سمجھنا ضروری ہے اور اگر ہم ہر بات پر اتفاق نہیں کر سکتے تو کم از کم اختلاف رائے پر اتفاق کرنا چاہیئے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ کس بات پر ہم متفق ہیں اور کس بات پر اختلاف رائے ہے۔ ہندوستان کے ہر حساس انسان کو پچھلے چھ مہینے میں اذیت اور تکلیف پہنچی ہے اور سب سے معیوب بات یہ ہوئی ہے کہ ان کی روح کی ذلت ہوئی۔ میرا ۔ تجربہ کار لوگوں کے لئے یہ کافی تکلیف دہ تھا لیکن مجھے اکثر تعجب ہوتا ہے کہ نوجوانوں کے کیا احساسات ہیں جو اپنی زندگی کے دروازے پر کھڑے ہوئے ہیں اور جنھوں نے آلام و مصائب اور تباہی کو دیکھا اور اُن کا مقابلہ کیا ہے۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ وہ اس پر غالب آجائیں گے لیکن بہت ممکن ہے کہ ان کی باقی زندگی پر اس کے نشانات باقی رہیں۔ لیکن اگر ہم دانشمند ہیں اور اب بھی صحیح راستہ پر چلنے کی طاقت رکھتے ہیں تو ممکن ہے کہ ہم اس داغ کو دھو ڈالنے میں کامیاب ہو جائیں۔

مجھے ہندوستان پر فخر ہے صرف اس کی قدیم عظیم الشان میراث کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے بھی کہ دور دراز کے ملکوں سے آنے والی فرحت افزا اور تازگی بخش ہوا کے لئے اس نے اپنے دماغ اور اپنی روح کے دریچے اور دروازے کھلے رکھ کر ثابت کر دیا کہ اس میں [illegible] کی عجیب و غریب اہلیت موجود ہے۔ ہندوستان کی طاقت کا راز دو باتوں میں مضمر ہے اس کا اپنا فطری تمدن جو کئی صدیوں میں پروان چڑھا ہے اور دوسرے ذرائع سے مستفیض ہو کر اپنے تمدن کو مالا مال کرنے کی اہلیت۔ اس میں خود اتنی توانائی موجود ہے کہ وہ بار بار [illegible] دنیا کو [illegible] دیں۔ یہ ملک اور اس میں اتنی دانشمندی بھی موجود ہے کہ اس نے اپنے آپ کو اُن سے علیحدہ بھی نہیں کیا اسی وجہ سے ہندوستان کی حقیقی تاریخ میں [illegible] مذہب اور راستہ ایک [illegible] سے اور متعدد سیاسی تبدیلیوں کا تنوع لیکن اس سے بہت ہی ساتھ اس کے تمدن کے نشو و نما پر بہت کم اثر پڑا ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ ہندوستانی میراث اور اپنے آباء اجداد پر فخر کرتا ہوں جنھوں نے ہندوستان کو ذہنی اور تمدنی برتری بخشی ہے۔

اس ماضی کے متعلق آپ کے تاثرات کیا ہیں؟ کیا آپ بھی اس کے حصہ دار اور وارث ہیں اس لئے آپ بھی اس چیز پر فخر کرتے ہیں جو آپ کی اتنی ہی ملکیت ہے جتنی میری ہے یا آپ اس سے اجنبیت محسوس کرتے ہیں اور اس کو سمجھے بغیر اس کا چرچا کرتے ہیں وہ عجیب و غریب سنسنی بھی محسوس کرتے ہیں جو اس احساس سے پیدا ہوتا ہے کہ ہم اس شاندار خزانے کے ولی اور وارث ہیں؟ میں آپ سے یہ سوال اس لئے کرتا ہوں کہ پچھلے چند برسوں بہت سی ایسی طاقتیں کار فرما رہی ہیں جنھوں نے عوام کے دماغ غلط افکار میں مبتلا کر دیئے تھے اور صحیح تاریخ کے راستہ کو مسدود کرنے کی کوشش کی تھی۔

آپ مسلمان ہیں اور میں ہندو ہم مختلف مذہب کے پیرو ہو سکتے ہیں یا یہ بھی ممکن ہے کہ ہم کسی مذہب کو نہ مانیں لیکن اس کی [illegible] ثقافتی میراث سے محروم نہیں ہو سکتے۔ جو آپ سب کی ہے ماضی ہم سب کا مشترک ہے اس لئے حال یا مستقبل بھی [illegible]

شاعری کے میدان میں اول انعام دو نوجوان شاعروں کو ملے۔ الکسی نیڈوگنوف کو "سوویت کے گاؤں پر پرچم کی خاطر" اور نکولے گریب اتوف کو "بالشوک کا پنچایتی کھیت" لکھنے پر۔ دونوں نظموں کا موضوع ایک ہے وہ ہے جنگ کے بعد کسانوں کے کھیتوں کو دوبارہ اجتماعی طور پر آباد کرنا۔ اور سوویت کے گاؤں میں اشتراکی اصولوں کو کامیابی کے ساتھ عمل میں لانا۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ ان شعرا نے اس اہم موضوع کی طرف اپنا رخ کیا ہے۔

ولادیمیر سسیورا نے جنگ کے بعد نظموں کا مجموعہ Let the orchards Rustle کو بھی اول انعام دیا گیا۔ سسیورا یوکرین کا غیر معمولی شاعر ہے۔ ابھی حال میں سوویت کے ادبی مرکز میں شاعر کی ادبی زندگی کی پچاسویں سالگرہ منائی گئی ہے اس کا یہ مجموعہ زندگی کا ایک سنگ میل ہے۔ اور ساتھ ساتھ ایک زبردست قیمتی تحفہ ہے جو زمانہ حال میں یوکرین کی شاعری کو ملا ہے۔

دوسری قابل دید نظمیں۔ جان سدربکل کی "ایک خوش اخلاق خاندان میں" اور میکسیم تنک کی "کیا تم نے دیکھا تھا" ہیں۔ دوران جنگ کی نظموں میں پرانے زمانے کا ایک شاعر جان سدربکل صرف خود کو بہ حیثیت شاعر ہی نہیں پیش کرتا بلکہ ایک وطن پرست کی طرح اپنے ساتھیوں کو سوویت فوج میں داخل ہو کر نفرت انگیز دشمن کے خلاف جنگ کے لئے آواز بھی دیتا ہے۔

میکسیم تنک مغربی روس کی کمیونسٹ روسی تحریک کے تجربہ کار سپاہی نے اپنی تازہ نظموں کا مجموعہ مرتب کیا ہے۔ جس میں روس کی جنگ کے بعد کی زندگی کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے

تاجک شاعر مرزا ترسن زادہ نے اپنی ان نظموں میں جو اس نے ہندوستان پر لکھی تھیں اور جن پر انھیں انعام ملا ہے عالمگیر اور گہرے موضوع کو پیش کیا ہے۔ شاعر خود ہندوستان آیا تھا اور یہاں رہ کر اس نے سامراجی مظالم خود اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ یہ نظمیں محکوم لوگوں کے حالات کی ہو بہو تصویر ہیں۔

چار ڈراموں میں صرف ایک ڈرامہ جیک سس کے "سرحد کے بعد جنگ" کو استالن انعام ملا۔

بورس رومشف کے "بڑی طاقت" میں سوویت سائنس دانوں کی دنیا پر بحث کی گئی ہے۔

نکولے ورتا کے ڈرامہ "ہماری روزانہ روٹی" میں سوویت کے گاؤں کی روزمرہ زندگی کو دکھایا ہے۔ جہاں نئے اور پرانے اور ترقی پسندوں اور رجعت پرستوں کے درمیان کشمکش جاری ہے۔ تقریباً اسی موضوع پر اناطولی رانس نے بھی لکھا ہے۔

ادبی اور فن تنقید کے میدان میں اس سال پہلی مرتبہ استالن انعام پیش کیا گیا ہے جس سے اس میدان کی وسعت اور اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بورس اسرف موسیقی کا استاد ہے۔ اسے اپنی کتاب "گلنکا" پر اول انعام ملا ہے۔ دوسرا انعام ملیسا نیکنا کے گرب ڈوف اور دسمبرسٹ اور بورس میلیخ کی کتاب "لینن اور روسی ادب کے مسائل ۱۹ صدی کے آخر اور ۲۰ صدی کی ابتدا میں" کو ملا۔

سالانہ استالن پرائز سوویت کے ادیبوں کی زندگی میں ایک خاص اہم درجہ رکھتی ہے۔ اس سال خاصکر بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ کیونکہ اس سال ادبی میدان میں گذشتہ سال سے زیادہ کوششیں، ترقیاں اور وسعتیں ملتی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سوویت ادب روز بروز ترقی کر رہا ہے۔ یہاں کا ادب جنگ کی سخت آزمائشوں کے بعد ہی راہوار اور تیز رفتاری کو ساتھ لیکر ابھرا ہے۔ سوویت ادب ملک کی زندگی، اس کی ترقی اور تعمیر میں زیادہ سے زیادہ سرگرمی سے حصہ لے رہا ہے۔

سوویت ادیب صرف عوام کی قدر شناسی ہی کو اپنی کامیابی تصور نہیں کرتے بلکہ اُن کے سامنے عوام کی بھلائی کے لئے اس سے بھی زیادہ تیز اور ان گنت سرگرمیاں ہیں اور اشتراکیت کی خدمت ہے۔

...س کی توجیہ اسی نظریہ کی بنا پر کی جس کی بنیاد پر کیمسٹری کی موجودہ اکثر مشکلات کی توجیہ ہو سکتی ہے۔
...مجھے اس بات کا بہت خطرہ تھا کہ کہیں ڈاکٹر جوشی اس وجہ سے موافقت نہ کریں تو چونکہ اس مسئلہ پر
...اہمیت رکھتی ہے۔ اس لئے میرے اپنے نظریہ کی حقیقت لوگوں کی نظر میں بہت کم ہو جائے گی۔ حالانکہ یہ پہلو میرے
...تھا۔ بہرحال میں نے اپنی بات سمجھا کر کہدی۔ لوگ جو تذبذب آپس میں گفتگو کر رہے تھے خود کو ترکی ٹوپی اور کالی
...بہت کچھ خاموش ہو گئے۔ میرے بعد ڈاکٹر جوشی جواب دینے کے لئے کھڑے ہوئے۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ مجھے کس سکون
...نے میرے نظریہ کی بہت کھلے دل سے تعریف کی۔ انھوں نے کہا کہ اس مسئلہ پر میں نے اس پہلو سے کبھی غور نہیں
...دوست کے خیالات نہایت Suggestive ہیں۔

اس جلسہ کے بعد مختلف لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ لوگوں نے اس نظریہ کی بہت تعریف کی۔ ان میں ڈاکٹر جوشی اور ...
...کے خلوص دل کا میں بہت معترف ہوں۔ پروفیسر منڈلے بھی اس جلسہ میں شریک تھے۔ بعد میں ایٹ ہوم میں ملاقات ہوئی
...آنے کی دعوت دی تو کہا کہ مجھے علی گڑھ آنے کا بہت اشتیاق ہے اور ضرور آؤں گا۔ دوسرے دن پھر ایک اور جگہ ملاقات
...مباحث پر بات چیت ہوئی۔ اسی ایٹ ہوم میں ڈاکٹر جوشی سے بھی دوبارہ ملاقات ہوئی کافی دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔
نظریہ کے ذریعہ "جوشی اثر" کی توجیہ کے متعلق ان سے بات چیت کی اور اس کے چند نتائج بتائے۔

۴ تاریخ کو میرے مقالہ کی باری آئی۔ پریسیجو ارادے عام دستور کے خلاف میرے مقالہ کی اہمیت بتلائی ا...
کافی بحث ہونی چاہیئے۔ میں نے اپنے دونوں مقالوں کے متعلق گفتگو شروع کی تو صدر صاحب نے ٹوکا کہ اگر آپ کا مفروضہ ...
جائے تو بقیہ مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔ اس لئے آپ محض اپنے مفروضہ پر گفتگو کریں۔ اگرچہ یہ دستور کے خلاف تھا ...
اسی مفروضہ پر تقریر کی۔ جب میں اختتام پر بیٹھا تو صدر صاحب نے فرمایا کہ اب اس مسئلہ پر بحث ہونی چاہیئے۔ تمام ہال میں ...
لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر داس (کانپور) نے کہا کہ ایسے اہم مقالہ پر بغیر سوچے سمجھے کچھ نہیں کہا جا...
ہمیں افسوس ہے کہ مقالات کے اقتباسات ہمیں گھر نہیں بھیجے گئے۔ تاکہ ہم اس مسئلہ پر سوچ کر آتے۔ صدر صاحب نے ...
موجودہ کی دشواریوں کی طرف توجہ دلا کر معذرت چاہی۔ جب کوئی اور نہ اٹھا تو صدر صاحب پروفیسر ... صدر انڈین کیمیکل ...
نے کہا کہ آپ اعتراض کریں۔ میں نے یہ بات پیش کی تھی کہ کلورین کے سالمے کو Cl Cl کی حیثیت سے پیش کرنا غلط ...
اس ضابطہ سے اس کی کیمیاوی فعالیت کا اظہار ہوتا ہے۔ نہ اس کے رنگ کی توجیہ ہوتی ہے۔ کلورین سبزی مائل زرد ...
اس ضابطہ کے لحاظ سے اسکو بے رنگ ہونا چاہیئے نہ اس کی توجیہ ہوتی ہے۔ اس کی برقی موصل...
ہو سکتی ہے اور "جوشی اثر" کی وجہ بیان کی جا سکتی ہے۔ اور نہ روشنی سے سالمہ کے ٹوٹنے پر جو اثرات نمایاں ...
ان کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اس لئے ہمیں اس سالمہ کو اس طرح کا ضابطہ دینا چاہیئے۔ $\frac{1}{2}Cl^{-}\ \frac{1}{2}Cl^{+}$ جس ...
Semi Polar Single Bond کہتا ہوں۔ اس کی مدد سے دوسرے مسائل بھی حل ہو سکتے ہیں۔ جس ...
دوسرے مقالہ میں کیا تھا۔

ڈاکٹر ... نے ابھی اعتراض کر کے فارغ ہوتے ہی تھے کہ ڈاکٹر داس (کانپور) نے خود ان پر اعتراض کر دیا کہ اگر ...
صحیح ہے تو پھر Cl_2 میں رنگ کیوں ہوتا ہے۔ اس پر فاضل پروفیسر کو خاموش ہونا پڑا۔ ڈاکٹر اسحاق (پٹنہ) جنھوں ...
... مرکبات پر کام کیا تھا انھوں نے بھی ایک اعتراض کیا۔ یہ میرے کام (مقالہ ۲) کے بہت معترف تھے اور حس...
نے میری ہمت افزائی کی تھی اس کے لئے میں ان کا بہت شکر گذار ہوں۔ بہرحال اعتراض کا جواب میں نے مسکت طور پر د...
ایک صاحب نے $\frac{1}{2}$ - ، $\frac{1}{2}$ + کے ہندسوں پر اعتراض کیا۔ میں نے انھیں سمجھایا۔ دوسرے صاحب نے کہا کہ اس کو ...
... بعض لفظوں کا ہیر پھیر تھا میں نے کہدیا کہ یوں بھی کہہ سکتے ہیں۔ صدر صاحب نے حسب معمول تعریفی کلمات
... لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہدیا کہ ہم کو اطمینان نہیں ہوا۔ حالانکہ اس کا کوئی حل نہ تھا۔ میں نے فوراً ...
... دیا ہو جس کا میں جواب نہ دے سکوں تو آپ کا کہنا بجا تھا۔ لیکن بغیر اس بات کے ...
... سب طرف سے معذرت طلبی شروع ہوئی۔ پریسیجو ارادے صاحب نے بھی معذرت کی۔ جلسہ کے ...
... کہ اگر اس کو مان لیا جائے تو ہمیں اپنے خیالات میں بنیادی تبدیلیاں کرنی پڑیں گی۔

اعتراض نہیں کرتے تاہم ہم کو محتاط ہونا پڑتا ہے۔

اسی جلسہ میں ایک اور دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ایک صاحب نے مقالہ پڑھا۔ جس پر میں نے اعتراض کیا۔ بحث کے بعد [illegible] گوہار ٹینہ، میرا ہاتھ پکڑ کر باہر لائے اور کہنے لگے کہ بیس سال رنگوں پر تحقیق کے بعد میری یہ خواہش ہے کہ ان کی توضیح [illegible] برقیاتی نظریہ پر کردوں۔ آپ اس سلسلہ میں کافی دلچسپی رکھتے ہیں براہ مہربانی میری مدد کیجیے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ [illegible] میرے پاس بھیج دیجیے، میں کوشش کروں گا کامیابی ناکامیابی خدا کے ہاتھ ہے۔

مختلف لوگوں نے میرا پتہ پوچھا اور مجھ سے دلچسپی لی۔ ان کا خیال تھا کہ میں علی گڑھ میں پروفیسر ہوں اور وہاں کا تحقیقی کام میری ماتحتی میں ہوتا ہے۔ ان بیچاروں کو کیا معلوم کہ میں انٹرمیڈیٹ کلاسوں کا پڑھانے والا ہوں۔ فرصت کے چند گھنٹوں میں ایک تیرہ و تار کمرہ میں تنہا بغیر کسی نوکر یا طالب علم کی مدد کے تھوڑا بہت کام کرتا رہتا ہوں۔ بہر حال میں نے انھیں بتایا کہ میں [illegible] ہو ماتو کہا میں تو علی گڑھ کا محض ایک لکچرر ہوں اور وہ بھی جونیر۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ علی گڑھ میں تحقیقی کام میری ماتحتی میں نہیں ہوتا ہے گو میں نے یہ نہیں کہا، وہاں کے اکثر پروفیسر اور طالب علم ایسے اہم کاموں میں اس درجہ مصروف ہیں کہ ان میں سے بعض کو یہ بھی معلوم نہ ہوگا کہ Semi polar Single Bond کیا ہے اور کس طرح وہ کیمیا کی موجودہ مشکل کو حل کرسکتا ہے۔

اسی زمانے میں سائنس کے کام کرنے والوں کی ایسوسی ایشن کا جلسہ ہوا جس میں حمید الحسن صاحب علی گڑھ کی طرف سے کونسل میں چن لیے گئے۔ علی گڑھ کے طالب علم ہر موقع پر اپنے لیے ایک جگہ پیدا کرسکتے ہیں۔ چنانچہ اس کا مظاہرہ اس سائنس کالج میں بھی ہوا۔

علی گڑھ کے لڑکوں نے ڈاکٹر سید محمود کو جا گھیرا۔ بیچارے بڑے خلوص دل سے ملے، ہم سب لوگوں پر ان کی محبت اور اُن کی شرافت کا بڑا گہرا اثر پڑا۔ ان سے ایک موٹر لاری لی جس پر بیٹھ کر پٹنہ کی سیر کی۔ ڈاکٹر صاحب ہی کے یہاں پروفیسر کا [illegible] سے ملاقات ہوئی۔

ڈاکٹر کانجو صاحب بڑی گرم جوشی سے پیش آئے۔ چونکہ آجکل وہ بہار صوبہ کے صنعت کے ڈائرکٹر بھی ہیں۔ ان کی مدد سے لڑکوں نے یہ بھی طے کرلیا کہ ڈالمیانگر میں ایم ایس سی کے طالب علم کو چند ماہ کی ٹریننگ ملا کرے گی۔ کانجو صاحب کی شرافت کے بھی ہم لوگ بہت قائل ہوئے۔ ہم اُن کے بہت مشکور ہیں۔

استدراک و تصحیح:۔ متعلق مقالہ "غالب کی راست گفتاری"

۱) صفحہ ۲۸ کلیات ابن یمین مجلد ا سے متعلق اپنی لکھی ہوئی یادداشت کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس میں رباعیاں ہیں۔ کتب خانہ مشرقیہ بانکی پور میں اشعار ابن یمین کے جتنے قلمی نسخے ہیں، سب دیکھے۔ کسی میں وہ قطعہ نہیں جس کا غالب نے ذکر کیا ہے۔

۱) صفحہ ۳۰ سطر ۱۸، ۱۹ — اس کا امکان کہ تہدنے مصرع اس طرح لکھا ہو جس طرح اودھ کے مطلع میں ہے بہت کم ہے۔

۲) صفحہ ۳۴ سطر ۱۴ — میری رائے میں غالب کا خط ضرور نصیر الدین حیدر کی وفات سے قبل کا ہے، لیکن اس کے متعلق اختلاف رائے ممکن ہے "میری تحریر میں یہ ظاہر ہے" قابل ترمیم ہے۔

۴) صفحہ ۳۸ سطر ۱۵ "بات ہے" کے بعد اضافہ "از روئے دفتر" تصدیق اس لیے نہیں ہو سکتی تھی کہ یوسف علی خاں نے دعوے ہی نہیں کیا تھا۔

مضمون میں بعض اغلاط رہ گئے ہیں، یہاں صرف اہم اغلاط کی تصحیح کی گئی ہے:۔ (۱) صفحہ ۳۳ سطر ۱۰ – اور حاشیہ صفحہ ۳۸ پر ناموں کے آگے "صاحب" کا اضافہ ہونا چاہیے۔ (۲) صفحہ ۳۵ سطر ۶ "اغلاط عربی" کی جگہ "اغلاط الفاظ عربی"۔ (۳) صفحہ ۳۴ سطر ۱۶ "اس بات کے" جگہ "در اس کے"۔ (۴) صفحہ ۳۷ سطر ۲۰ "اس کے بعد" حذف کردیا جائے۔ (۵) صفحہ ۳۹ سطر آخیر "آتش" قرأت ہونا چاہیے۔

بہت سے لوگ اتفاق نہیں کرتے اس لئے ان کو انجمن سے علیحدہ ہو جانا چاہیئے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس تحریک میں کوئی بھی شائبہ حقیقت کا ہو [illegible] لوگ جو یہ رکھتے ہیں خواہ اُن کا مسلک کچھ ہی کیوں نہ ہو اُنکی حیثیت ہمیشہ یکساں ہے اور یکساں ہونی چاہیئے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ [illegible] آپ اس مسئلہ پر غور کریں تو یہ بات دل سے محو کر دیں [illegible] سوچیں کہ وہ شخص کس عقیدے سے تعلق رکھتا ہے یا اس کا مسلک کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اردو کی طرف سے ہرگز ہرگز مایوس نہیں ہوں۔ ہاں بعض اُردو والوں کی حرکتوں سے مایوس ضرور ہوں۔ یہ خیال کتنا غلط ہے کہ اُردو کا تعلق صرف مسلمانوں سے ہے۔ اُردو کا تعلق صرف مسلمانوں سے ہرگز نہیں بلکہ اس کا تعلق اس ملک کے بیشتر رہنے والوں سے ہے۔ یہ بات بڑی نازک ہے اور نازک میں خطرناک کے معنی میں استعمال نہیں کر رہا ہوں۔ ایک وقت آیا جب کچھ لوگوں نے ایک تحریک اٹھائی اور وہ [illegible] آئی۔ کچھ لوگ رہ گئے، کچھ چلے گئے۔ جو چلے گئے اُن کے بارے میں میری رائے کچھ اچھی نہیں۔ یہ کہنا غلط ہے کہ اُردو کسی خاص فرقے یا طبقہ کی ملکیت ہے۔ کوئی مخصوص گروہ اسکی اجارہ داری کا مدعی نہیں ہو سکتا لیکن اُن لوگوں کو جو آج [illegible] میں اُس سے رشتہ توڑ رہے ہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ تاریخ ان کو انہیں الفاظ میں یاد کرے گی جن سے آج ہندوستان سے کسی دوسرے ملک میں جانیوالوں کو یاد کیا جاتا ہے۔ صاف صاف الفاظ میں یہ غداری ہوگی۔ اس زبان کو ہم دونوں نے پایا، دونوں نے اسکی خدمت کی، اسپر فخر کیا اور اس پر ہم دونوں کو ناز ہے۔ اب حکومت کے کہنے سے اگر وہ ساتھ چھوڑ دینگے تو وہ قابل الزام ٹھہریں گے اور دیکھیں اس کا خیال رکھنا چاہیئے کہ ان کا نام مورخ کہاں کس طرح لیا جائے گا۔

لکھنؤ میں اُردو کی [illegible] چاہیئے جو بعض جگہ حالت بنادی گئی ہے، ایک چیز پورے طور پر ملحوظ رکھیں، یہ بات ہماری سرشت میں داخل ہو گئی ہے کہ جو حکومت کہتی ہے وہ صحیح ہوتی ہے اور عوام کے کرنے پر صحیح سے محو [illegible] رہ جاتا ہے اور جو کچھ ہم کہیں گے یا کریں گے وہ یکسر خراب و ناقص ہے۔ حکومت کا کسی چیز کو نافذ کر دینا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ حق بجانب ہے۔ اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے رشید صاحب نے اُردو کے مستقبل کے بارے میں [illegible] والوں سے ایک بار پھر اپیل کی کہ موجودہ حالات [illegible] اور پروان چڑھانے کے لئے جد و جہد کریں۔

یونیورسٹی کی عام حالت۔

تعداد: ۔ فسادات اور تقسیم ہند کا ہماری یونیورسٹی پر گہرا اثر پڑا ہے۔ دور دراز کے طلباء فسادات اور دہلی کے ہنگاموں کی وجہ سے اور تقسیم کی وجہ سے اور راستے کے خطرات کے باعث سرحد، کشمیر، پنجاب، سندھ کے طلباء نہیں آ سکے۔ جو آئے ہیں اُن کی تعداد بہت کم ہے لیکن انڈین یونین کے طلباء کی بہت اچھی خاصی تعداد اس سال [illegible] یو پی، سی پی میں صوبہ متحدہ اور بہار کے طلباء کی تعداد سب سے زائد ہے۔ حیدرآباد کے معاملات ختم ہو جانے کے باعث اب وہاں سے بھی کچھ طلباء آنے شروع ہو گئے ہیں۔ مجموعی طور پر اس سال طلباء کی وہ کثرت تو نہیں جو کبھی پہلے تھی پھر بھی ان کی تعداد بہت اچھی ہے۔ صرف سر سید ہال میں ۱۵۰ ۔ وقار الملک ہال میں ۲ ۔ آفتاب ہال میں ۵ سے زائد ۔ سر شاہ سلیمان ہال میں ۹ ۳ ۔ اسکے بعد بھی داخلے ہوتے رہے ہیں۔ اسکول، گرلز کالج، طبیہ کالج وغیرہ کے طلبہ اور طالبات کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔ مجموعی تعداد طلباء کی اکیس سو ہے۔

غیر مسلم طلباء: ۔

سابق کی طرح اس سال بھی غیر مسلم طلباء یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ [illegible] طلباء کی وجہ سے اس سال تعداد بڑھ گئی ہے۔ باہر سے آنیوالے غیر مسلم طلباء عام طور پر ٹیکنیکل لائن کی طرف زیادہ متوجہ ہیں۔ ہوسٹل میں [illegible] مذہب کسی چیز کی تفریق نہیں رکھی جاتی۔ اکثر ہوسٹلوں میں غیر مسلم طلباء ساتھ رہتے ہیں اور ساتھ ہی کھاتے پیتے ہیں۔ [illegible] سلیمان ہال میں اُن کی اچھی خاصی تعداد ہے جو مسلم طلباء کے ساتھ رہ کر تعلیم میں مصروف ہیں۔ وہ طلباء جو الگ ہوسٹل میں رہنا چاہتے ہیں اُن کے لئے ایک علیحدہ ہوسٹل کا انتظام بہت پہلے سے ہے۔ امین ہوسٹل ایسے ہی غیر مسلم طلباء کے لئے مخصوص ہے۔

ہمارے ہال: ۔

آفتاب ہال اپنی پرانی علمی روایات کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ محسن الملک ہال کے ٹوٹ جانے سے اس ہال میں طلباء کی تعداد کچھ زائد ہو گئی ہے نتیجہ یہ ہے کہ موریسن کورٹ جیسے ہوسٹل میں بھی ایک کمرے میں تین تین طالب علم رکھے گئے ہیں۔ بہرکیف یہ ہنگامی چیز ہے۔ امید ہے جلد ہی اس کا تدارک کیا جائیگا۔ وقار الملک ہال میں زیادہ تر سائنس کے طلباء ہیں اور ان کے محبوب پرووسٹ پروفیسر طاہر رضوی کی وجہ سے انہیں ہر طرح کی سہولتیں میسر ہیں۔ سر شاہ سلیمان ہال میں ڈاکٹر رفیق احمد صاحب نے ایک خاص زندگی پیدا کر دی ہے اور امید ہے کہ ان کا دور دورِ سعید ثابت ہوگا۔ سر سید ہال اپنے محبوب و مقبول پرووسٹ جناب ایس ایم شفیع صاحب کی سرکردگی میں تیزی سے ترقی کے انتہائی مدارج طے کر رہا ہے۔ شفیع صاحب نے اپنے [illegible] اس ہال کو جس بام ترقی پر پہنچا دیا ہے اسکی نظیر علی گڑھ کی تاریخ میں ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ ان کی صبح و شام، دن رات اسی فکر میں گذرتی ہے کہ [illegible] کون سے وسائل اختیار کرنے چاہئیں جن سے طلباء کا فائدہ ہو اور ہال کی عظمت بلند ہو۔ وہ جس نظم و ضبط، استقلال، محنت اور [illegible]